وجودیت کے مشرقی اور مغربی تناظرات: سید ماجد شاہ کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

شمائلہ عزیز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۲ء

وجودیت کے مشرقی اور مغربی تناظرات: سید ماجد شاہ کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار:

شمائلہ عزیز

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۲ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: وجودیت کے مشرقی اور مغربی تناظرات: سید ماجد شاہ کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: شمائلہ عزیز رجسٹریشن نمبر: 1742/M/U/S19

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان و ادب اردو

ڈاکٹر صوبیہ سلیم _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر سید نادر علی _____

ڈایریکٹر جنرل

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، شمائلہ عزیز حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر صوبیہ سلیم کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

شمائلہ عزیز

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۲ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرستِ ابواب	iv
Abstract	vi
اظہارِ تشکّر	vii
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	
الف۔ تمہید	
i۔ موضوع کا تعارف	9
ii۔ بیان مسئلہ	9
iii۔ مقاصد تحقیق	10
iv۔ تحقیقی سوالات	10
v۔ نظری دائرہ کار	10
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	11
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	12
viii۔ تحدید	12
ix۔ پس منظری مطالعہ	12
x۔ تحقیق کی اہمیت	13
ب۔ وجودیت پسِ منظری مطالعہ	14
i۔ مفاہیم و خصوصیات	14

ii۔ سماجی و فلسفیانہ پسِ منظر 20
iii۔ اہم موضوعات 32
ج۔ وجودیت کے تناظرات 41
i۔ وجودیت کے مغربی تناظرات 41
ii۔ وجودیت کے مشرقی تناظرات 52
iii۔ اردو افسانہ اور وجودیت 57
د۔ سید ماجد شاہ کا تعارف 63
i۔ حالات زندگی 64
ii۔ ادبی زندگی 66
حوالہ جات
باب دوم: سید ماجد شاہ کے افسانوں میں لایعنیت 74
الف: لایعنیت کا وجودی پس منظر 75
ب: سید ماجد شاہ کے افسانوں میں لایعنیت 76
حوالہ جات
باب سوم: سید ماجد شاہ کے افسانوں میں تصور آزادی 99
الف۔ تصور آزادی کا وجودی پس منظر 99
ب۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں تصور آزادی 102
حوالہ جات
باب چہارم: سید ماجد شاہ کے افسانوں میں فرد کی انفرادیت 130
الف۔ فرد کی انفرادیت کا وجودی پس منظر 130

ب۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں فرد کی انفرادیت

حوالہ جات

ماحصل 133

الف۔ مجموعی جائزہ 150

ب۔ تحقیقی نتائج 150

ج۔ سفارشات 155

کتابیات 156

ABSTRACT

The topic of my thesis is Eastern and Western Perspectives of Existence, Analysis of Syed Majid Shah's Fictions.The study of the history and literature of that period gives us an idea of the existential problems of the people of that age.To analyze the existential problems of the individual of the present age, I have chosen two collections of fiction by Syed Majid Shah, "Qaaf" and "Ray". There are two main topics were discussed in the thesis. One is the background and perspectives of Existence and the other is the analysis of the existential elements in the fiction of Syed Majid Shah.

The research design of this study is qualitative using textual analysis as a research method: on the backend, interviews, research papers, analytical work on Existence and fiction is also cited was needed. Syed Majid Shah is among contemporary writer and this thesis would be covering the work of Syed Majid Shah utmost with study and analysis to bring it to the place it justified in Urdu literature.

اظہارِ تشکّر

اس مقالے کی تکمیل اللہ رب العزت کے خصوصی کرم کی بدولت ممکن ہوئی۔ جو رب رحیم ہے اللہ تعالیٰ کے بعد اپنے تمام اساتذہ کی شکر گزار ہوں جن کی بدولت میں اس مقام تک پہنچی۔۔خاص کر وہ تمام اساتذہ جو ایم فل کورس ورک میں میرے رہنمار ہے۔ جن میں ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر ارشاد بیگم اور ڈاکٹر صنوبر الطاف شامل ہیں۔ نگران مقالہ ڈاکٹر صوبیہ سلیم کا شکریہ جنھوں نے اس سفر میں میری رہنمائی فرمائی۔

میرے والدین، بہن، بھائی اور بھابی کا شکریہ جو اس سفر میں پل پل میرے ساتھ رہے۔ میری کولیگز، مس اعناب، مس نفیسہ، مس شازیہ اور اظہر عباسی جنھوں نے سرکاری ملازمت کے مسائل میں مجھے سہولت دی ان کی شکر گزار ہوں۔ تمام دوستوں کا شکریہ خاص کر ہم جماعت عارفہ طاہر جنھوں نے جامعہ کے معاملات سے باوقت باخبر رکھا۔ اسکے علاوہ سید ماجد شاہ، مفیدہ ماجد اور سرمد سروش کی بے حد شکر گزار جنھوں نے میرے تحقیقی کام کے حوالے سے بہت تعاون کیا۔

شمائلہ عزیز

اسکالر ایم فل اُردو

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i۔ موضوع کا تعارف

پیشِ نظر موضوع تحقیق "وجودیت کے مشرقی اور مغربی تناظرات: سید ماجد شاہ کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ" پر مشتمل ہے۔ سید ماجد شاہ "شعر و سخن" کے وسیلے سے متعارف ہونے والے افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے افسانوں میں مخصوص مذہبی و معاشرتی رویوں سے پیدا ہونے والے مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ جس میں فرد اپنی حیثیت اور وجود کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ آپ کی تحریروں میں وجودیت اور وجودی عناصر کو خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ سید ماجد شاہ وجودیت کے بیان کو داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر ضبط تحریر میں لانے کا ہنر رکھتے ہیں جن پر کم ہی قلم اٹھایا گیا ہے۔

وجودیت عربی لفظ "وجود" سے مشتق ہے۔ فرانسیسی لفظ "Existence" اور فارسی لفظ "ہست" وجود کے مترادف ہے۔ وجودیت بنیادی طور پر بحرانی دور کی پیداوار ہے۔ جو مخصوص معاشرتی و سماجی رویوں کی بدولت پروان چڑھی۔ سائنسی ترقی معروضیت، سیاسی و سماجی ابتری، جنگ عظیم اول و دوم کی تباہ کاریوں اور مذہب سے دوری نے فرد کو شناخت کے مسائل سے دوچار کیا۔ جس کے نتیجے میں دہشت، کرب، لایعنیت، ناامیدی، تشویش، فرد کی انفرادیت، تصورِ آزادی اور موت کی خواہش جیسے عناصر نے جنم لیا یہ سلسلہ اس وقت سے لے کر اب تک کسی نہ کسی صورت ہر معاشرے میں موجود ہے۔ پیش کردہ تحقیق میں وجودیت اور سید ماجد شاہ کے افسانوں میں وجودی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ

مصنف اپنے عہد کا نباض اور معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی تحریر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادیب اپنے دور میں ہونے والے واقعات اور رجحانات کو مکمل ذمہ داری اور غیر جانبداری سے ضبط تحریر میں لاتا ہے اور ادبی پیرائے میں پڑھنے والوں کے سامنے رکھتا ہے۔ اس لیے ادیب کو معاشرے

کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ سید ماجد شاہ کی تحریروں میں بھی وجودیت کا شعور ایک سماجی دانشور کے طور پر ملتا ہے۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں جدید دور کے انسان کو درپیش مسائل اور عصری تقاضوں کے پیش نظر پیدا ہونے والے امکانات اور رجحانات موجود ہیں۔ اس لیے ان کے مجوزہ مجموعوں میں وجودی عناصر پر تحقیق کی ضرورت کے پیش نظر تحقیق کی گئی ہے۔

iii۔ مقاصدِ تحقیق

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ وجودیت کے مشرقی اور مغربی تناظرات کو اجاگر کرنا۔

۲۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں وجودیت کو زیر بحث لانا۔

۳۔ وجودیت کے تناظر میں سید ماجد شاہ کی تحریروں کا ادبی مقام واضح کرنا۔

iv۔ تحقیقی سوالات

مجوزہ تحقیقی مقالے کے تحقیقی سوالات درج ذیل ہیں:

۱۔ وجودیت سے کیا مراد ہے؟ وجودیت کے مشرقی اور مغربی تناظرات کیا ہیں؟

۲۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں وجودیت کے عناصر کیا ہیں؟

۳۔ وجودیت کے تناظر میں سید ماجد شاہ کی تحریروں کا ادبی و فکری مقام کیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار

وجودیت فکر و نظر پر مبنی ایک ایسی تحریک ہے جس نے ایک عرصے تک مغرب کے اذہان کو اسیر رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام دنیا کے اہل فکر و نظر اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ یہ بحرانی دور کی پیدائش ہے۔ اس لیے ہر اُس خطے کے باشعور افراد اس سے متاثر ہوئے جہاں انتشار کی کیفیت نے جنم لیا۔ ادب میں تخلیق

کار کی تحریر کئی عناصر سے تشکیل پاتی ہے جس میں سے بعض عناصر اس صنف کے تقاضے کے تحت آتے ہیں جو تخلیق کار اختیار کرتا ہے جبکہ بعض عناصر سماجی و فلسفیانہ حالات و واقعات کے تحت اثر انداز ہوتے ہیں۔ جو مصنف کی تحریر، اسلوب اور موضوعات کو دوسروں سے منفرد بناتے ہیں۔ گو کہ وجودیت کے تناظر میں اردو شاعری اور ناول کے حوالے سے کافی تحقیقی کام منظر عام پر آچکا ہے۔ تاحال افسانے خاص کر جدید افسانے کے حوالے سے اس طرح کوئی ٹھوس اور جامع تحقیق سامنے نہیں آسکی۔ حالانکہ اردو ادب کے جدید اور بہترین افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقی جوہر سے ادب کا دامن وسیع کیا۔ مجوزہ تحقیق سید ماجد شاہ کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی و خارجی مسائل کو وجودی عناصر کے تناظر میں پرکھنے کے حوالے سے ہے۔ کہ انھوں نے کس منفرد انداز سے جدید معاشرے کے فرد کے وجودی عناصر کو اجاگر کیا اور کس طرح ان پر توجہ مبذول کروانے میں کامیاب ہوئے ان کے موضوعات اور کردار کس طرح منفرد ہیں اور جدید معاشرے اور ہماری عصری زندگی سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔

یہ تھیوری مغرب سے ہمارے ہاں منتقل ہوئی ہے اس لئے بنیادی مباحث کے لیے مغربی مفکرین کی آراء سے استفادہ لازم ہے۔ اس حوالے سے جن بنیادی کتب سے مدد لی گئی ان میں ایک کتاب ڈاکٹر جمیل احمد مجبی کی "فلسفہ وجودیت اور جدید افسانہ" سلطان علی شیدا کی "وجودیت پر ایک تنقیدی نظر" اور قاضی جاوید کی کتاب "وجودیت" شامل ہیں۔ ان کتب میں وجودیت اور اسکے بانی مفکرین کے نظریات کے حوالے سے تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ جن میں ہمیں کرکیگارڈ، ہائیڈگر، کارل جیسپرز، مارسل، سارتر اور نطشے کے نام ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ وجودی مفکر ژاں پال سارتر کا ایک مضمون جس کا ترجمہ قاضی جاوید نے "وجودیت اور انسان دوستی" کے نام سے کیا وہ بھی زیرِ مطالعہ رہا۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے اور مندرجہ ذیل باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تحقیق کی گئی ہے۔

۱۔ بنیادی کتب کو حاصل کرتے ہوئے ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

۲۔ ادبی جریدوں میں اس حوالے سے شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین سے استفادہ کیا گیا۔

۳۔ کتب خانوں سے مختلف شواہد جمع کیے گئے۔

۴۔ مصنف سے انٹرویوز اور ملاقات کرتے ہوئے ان کے خیالات کو قلم بند کیا گیا۔ اور ماہرین کی آرا لی گئیں۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

اردو ادب میں وجودیت کے حوالے سے ہر عہد میں نئے رجحانات پیدا ہوتے رہے اور محققین نے اپنی تحقیق کے ذریعے نئے ابواب کا اضافہ کیا۔ سید ماجد شاہ پر مختلف نوعیت کے تحقیقی کام ہوئے اس سلسلے میں پہلا تحقیقی مقالہ "سید ماجد شاہ بحیثیت افسانہ نگار" بی ایس کی سطح پر گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ہری پور سے ہوا۔ دوسرا تحقیقی مقالہ ایم۔ اے کی سطح پر "سید ماجد شاہ کے افسانوی مجموعہ "ر" کا تنقیدی جائزہ" گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد سے ہوا لیکن ماجد شاہ کے مجموعوں پر وجودیت کے حوالے سے کوئی بھی تحقیقی کام اب تک نہیں ہوا۔

viii۔ تحدید

اس تحقیق کا دائرہ کار تحقیقی موضوع "وجودیت کے مشرقی اور مغربی تناظرات: سید ماجد شاہ کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ" پر مشتمل ہے۔ اس مقالہ کے لیے ان کی دو کتب "ق" اور "ر" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان مجموعوں میں موجود افسانوں کو وجودی عناصر کے حوالے سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ وجودیت اور وجودی عناصر کے حوالے سے لکھی گئی کتب کا مطالعہ بھی شامل تحقیق ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر وجودی فکر اور تحقیقی و تنقیدی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ منتخب افسانوی مجموعوں اور وجودیت کے حوالے سے شائع ہونے والے مضامین اور ما قبل تحقیقی مواد کا مطالعہ شامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل احمد مجبی کی کتاب "فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ" اور قاضی جاوید کی کتاب "وجودیت" میں ، وجودی عناصر اور مغربی مفکرین کے حوالے سے مباحث کا مطالعہ شامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب "تنقید اور تجربہ" میں بھی وجودیت کے حوالے سے مباحث کا احاطہ شامل ہے۔ افسانے کے حوالے سے ڈاکٹر نگہت ریحانہ کی کتاب "اردو مختصر افسانہ ، فنی و تکنیکی مطالعہ" اور انور سدید کی کتاب "ایک صدی کے

افسانے" زیرِ مطالعہ ہیں۔ جبکہ سید ماجد شاہ کے فکر و فن کے حوالے سے پروفیسر بشیر احمد کی کتاب "ہزارہ میں اردو افسانہ" کی روایت شامل مطالعہ ہے۔

x۔ تحقیق کی اہمیت

افسانہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے نمایاں مقام و مرتبے کا حامل ہے اور ادب میں اس کی اہمیت و مقام سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ افسانہ نگاروں کے تخلیقی جوہر نے اسے ہر دور میں نئے زاویے سے پیش کیا ہے۔ یہ مختلف تہذیبوں اقوام اور معاشروں میں پیدا ہونے والے نئے رجحانات اور تبدیلیوں کو جامعیت اور وحدت تاثر کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یوں افسانے کو ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ مقالہ بھی جدید افسانے کے حوالے سے ایک پیش رفت ہے کہ کس طرح وجودیت تہذیب، مذہب اور معاشرت پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس سے پیدا شدہ مسائل اور الجھنیں کیا ہیں؟ ان سے بچنے کا راستہ کیا ہے؟ اور کیا سید ماجد شاہ کے افسانوں میں وہ جدت اور رجحان موجود ہے۔ جو وجودیت کے حوالے سے کسی نئے باب کا اضافہ کر سکتا ہے؟ اس مقالے میں ایک طرف افسانہ نگاری کے فنی لوازمات کے حوالے سے مباحث کا اضافہ کیا جائے گا تو دوسری طرف وجودیت اور وجودی عناصر کی جدید معاشرت پر اثر انداز ہونے کے حوالے سے تفہیم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ب۔ وجودیت پس منظری مطالعہ

انسانی شخصیت ایک معمہ ہے۔ وہ کائنات کے لیے نہیں بلکہ کائنات اس کے لیے بنائی گئی ہے۔ کائنات کی بازیافت انسان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس طرح انسان کی خوبیوں، خامیوں، اقدار، صفات اور کمزوریوں کو اس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی شخصیت کا یہی تضاد اس کے انسان ہونے کی دلیل ہے۔ انہی نہاں خانوں کی چھان بین اور جستجو میں انسانی تاریخ کئی ادوار سے گزری ہے۔ ہر دور میں سوچنے سمجھنے والے اذہان نے نئے افکار و خیالات کو جنم دیا جو بعد میں نظریات، رجحانات اور تحریکوں کی صورت میں ابھرے۔ یہی فلسفے و رجحانات انسان کو شعور و آگہی سے نوازتے رہے ہیں۔

بعض اوقات فرد کے ذہن میں سوالات جنم لیتے ہیں جن کی نوعیت، عقلیت اور منطق سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہ داخلی آوازیں ہیں جو انسان کے اندر اضطراب کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ یہ سوالات انسانی شخصیت کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً فرد کبھی کبھی خود سے سوال کرتا ہے۔

میں کیا ہوں؟ کائنات میں میرا مقام کیا ہے؟ میری حیثیت اور پہچان کیا ہے؟ اس وسیع و عریض کائنات سے میری کیا وابستگی ہے؟ یہ اور اس طرح کے کئی دوسرے سوالات جو انسانی ذہن میں انتشار کی کیفیت پیدا کریں وجودی رجحان کے آئینہ دار ہیں۔ دور حاضر کے فلسفیانہ رجحانات میں وجودیت کا ایک منفرد مقام ہے جس نے مشرق و مغرب میں یکساں پذیرائی حاصل کی۔ وجودیت عہد حاضر کی فکری تحریک ہے جس نے ہمیشہ اس عہد کی پیچیدگیوں اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ مایوسی کرب اور تسلیم شدہ روایات کے خلاف بغاوت کی۔ سیاسی، مذہبی، اخلاقی، سماجی اور جمالیاتی اقدار کی شکست و ریخت نے ہی وجودی فلسفے کے لیے خام مواد مہیا کیا۔ جب مذہب، اقدار، عقل اور سائنس انسانی وجود کو تسکین دینے میں ناکام ہوئے تو ایک نئی فکر نے جنم لیا جو وجودیت کہلائی۔

i۔ مفاہیم و خصوصیات

فلسفہ وجودیت کا آغاز یورپ سے ہوا۔ اس لیے اس کی اصطلاحات انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبان میں ہیں۔ اردو میں یہ اصطلاحات انگریزی سے منتقل ہوئی ہیں۔ اردو میں اس کے معنی و مفہوم کچھ یوں ہیں۔ فرہنگ آصفیہ جلد چہارم میں وجود کے معنی ہیں۔ "ہستی، ذات تقیض عدم، موجودگی، بود، مجازاً جسم بدن"[1]

وجودیت عربی لفظ وجود سے مشتق ہے۔ سنسکرت میں "استو" اور فارسی لفظ " ہیت " وجود کے مترادف ہیں۔ انگریزی لفظ Existance جس کا ترجمہ وجود ہے لاطینی الفاظ Ex اور sister کا مجموعہ ہے۔ جس کے معنی(To stand out) کے ہیں۔ ہائنڈیگر کے ہاں یہی لفظ Dasein کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی To Be (موجود ہونا) کے ہیں۔ وجودی مفکرین کے ہاں یہ لفظی معنی باریک نکتے کی طرف اشارہ ہیں۔ جس کی دو صورتیں ملتی ہیں۔ To Exist (موجود ہونا) اور To Live (جینا)۔ وجودیت اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ فرد کی پیدائش سے ہی اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے تمام تر شعور کے ساتھ ایک آزادانہ زندگی بسر کرے۔ اس پر پابندی لگانے والا کوئی نہ ہو۔ یہ پہلی صورت To Exist (موجود ہونا) ہے اور یہی بہترین طرز حیات ہے۔ ایک وہ زندگی بھی ہے جو ہم حالات، ماحول اور اقدار کے پابند ہو کر بسر کر دیں یہ ایک عمومی طرز زندگی ہے جس میں اپنی مرضی کا دخل نہیں ہوتا یہ صورت To Live (جینا) کہلاتی ہے۔ To Exist (موجود ہونا) پر تمام وجودی مفکرین متفق نظر آتے ہیں۔ یوں وجودیت کے لغوی اور صرفی معنی اخذ کرنا مشکل نہیں یہ ایک ایسا طرز فکر ہے جو انفرادیت اور استقامت پر زور دیتا ہے۔ روایتی مفہوم میں وجود سے مراد ٹھوس جسم ہے۔ جیسے کرسی، درخت، کتاب وغیرہ یا غیر مرئی وجود جیسے جن، بھوت وغیرہ۔ لیکن وجودیت پسند مفکرین کے ہاں مذکورہ بالا اشیاء وجود کی حامل نہیں ہیں۔ ان کے ہاں وجود سے مراد انسان کی ذات، ہستی اور ہونا ہے۔ اپنے من میں اٹھنے والے سوالات کے جواب تلاش کرنا ہے اور وقت و حالات کے درمیان اپنی بقا کی جنگ لڑنا ہی انسان کا خاصا رہا ہے۔ اس صورتحال میں انسان مسلسل اذیت اور انتشار کا شکار رہا۔ اسے اپنی ذات ہی تسلی بخش نظر آئی جس پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا تھا یعنی اپنی موضوعیت پر یقین کرنا فرد کی مجبوری ہے۔ یہی موضوعیت جو فرد کو شعور کی طرف مائل کرتی ہے۔ اپنی ذات پر یقین کامل کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور جہد مسلسل کے لیے تیار کرتی ہے۔ بقول سلطان علی شیدا کے:

> " وجودیت پسند ان تمام انواع کی بیگانگی کا حل تلاش کرنے کے لیے
> داخلیت پر زور دیتے ہیں اور انسان کو اپنے ذاتی وجود کی اصلیت کو
> پہچانے کی دعوت دیتے ہیں "(۲)

جب کوئی شخص اذیت، لایعنیت، دہشت، آزادی اور اضطراب کی بات کرتا ہے تو درحقیقت وہ ہماری توجہ انسانی وجود کی ان صداقتوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے جن سے وہ محروم ہے۔ وہ اپنی تقدیر خود بنانا چاہتا ہے اور سماج کے بنائے ہوئے رسوم و رواج سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو لوگ سماجی پابندیوں

میں جکڑے ہوئے ہیں وہ زندہ تو ہیں لیکن ان کا کوئی وجود کامل نہیں۔ معاشرے کا ایک نا معتبر شخص بھی وجود سے خالی نہیں ہے کیونکہ زندگی کے کسی موڑ پر اس کے اندر اپنی پہچان اور شناخت کی خواہش جاگ سکتی ہے۔ اس طرح ایک معتبر شخص ذرا سی لاپرواہی سے اپنے وجود کو نا معتبر کر سکتا ہے۔ مارسل کے خیال میں وجودی کمی ہر فرد میں موجود ہے۔ باخبری یا آگاہی اس امکانی وجود کو فروغ دے سکتی ہے۔ مسائل ہر انسانی زندگی کو کرب سے دوچار کرتے رہتے ہیں اور کوئی بھی فرد ان کا شکار ہو سکتا ہے۔ یہ مسائل نہ تو نظری ہیں نہ معروضی، نہ منطقی اور نہ ہی سائنسی بلکہ یہ عملی اور وجودی مسائل ہیں جن کا حل اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ وجودی مفکرین کے نزدیک انسانی فطرت کا یقین انسانی اعمال کرتے ہیں نہ کہ فطرت انسانی اعمال کا تعین کرتی ہے۔ "وجود جوہر پر مقدم ہے" یعنی انسانی وجود اس کے جوہر پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس بات پر تمام وجودی مفکرین متفق ہیں۔ انسان اپنی فطرت سے نہیں عمل سے اپنی ذات کی پہچان بناتا ہے اور حقیقی وجود کا یقین کرتا ہے۔ فرد کے جوہر کا یقین اس کے وجود کی پہچان کے بعد ہی ممکن ہے۔ انسان سب سے پہلے اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ اپنے آپ سے نبرد آزما ہوتا ہے پھر دنیا پر اُبھرتا ہے۔ وجود اولین ترجیح ہے جو مستقبل کی آگاہی دیتا ہے جو ذاتی عمل سے ہی ممکن ہے فلسفہ وجودیت فرد کی داخلیت پر اصرار کرتا ہے جو آزادی اور بغاوت کی طرف اشارہ ہے لیکن یہاں انبوہ کی کیفیت نہیں ہے کیونکہ آزادی انبوہ دو سیدھی لکیریں ہیں جو ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں لیکن کبھی مل نہیں پاتیں۔ انبوہ ایک بھوت ہے جو فرد سے آزادی اور ذمہ داری چھین کر اسے بے راہ کر دیتا ہے۔ کارل یاسپرس نے اسے Mass Existence کا نام دیا ہے۔ یہ فرق اتنا معمولی ہے کہ کبھی بھی آزادی کو انبوہ میں بدل سکتا ہے۔ لفظ وجودیت پہلی بار کرکیگارڈ نے استعمال کیا۔ کرکیگارڈ کے نزدیک ایسا انسان جس کے پاس فیصلے کا اختیار نہیں وہ محض ایک شے بن جاتا ہے وجود نہیں رہتا۔ کرکیگارڈ کے نزدیک سچائی معروضی نہیں بلکہ داخلی اور ذاتی ہے۔ انسانی وجود احساسات، اعمال اور حرکات کا مرکز ہے۔ وہ اپنی فطرت خود بناتا ہے خود شناسی کی قوت ہی اسے ممکنات کی طرف لے جاتی ہے جو اسے نئی پہچان دیتی ہے وہ It (یہ) نہیں بلکہ I (میں) ہے۔

ہائیڈیگر کے نظریات نے اس امر کی مزید وضاحت یوں کی کہ فرد دنیا سے الگ ہوتا ہے اسے خطرہ رہتا ہے کہ وہ اپنا وجود نہ کھو دے۔ مختلف دنیائیں ہیں ہر دنیا کی اپنی دلچسپیاں اور زاویہ نظر ہے فرد آزاد ہے کہ وہ کس دنیا کا انتخاب کرتا ہے۔ سارتر نے دنیا کو انسانی حرکت سے تعبیر کیا۔ فرد اور دنیا ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں لیکن اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے فرد عمل کرتا ہے۔ دنیا اس پر رد عمل کرتی ہے۔ یہ دونوں

بیک وقت ایک دوسرے کے خلاف حالت جنگ میں رہتے ہیں۔ کبھی انسان اس کی گرفت میں آجاتا ہے اور کبھی کبھی دنیا پر حاوی ہو جاتا ہے۔ معتبر وجود کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ آدمی کا عمل اس کے جسم سے تعبیر ہے جسم کے بناوہ کوئی کام سر انجام نہیں دے سکتا۔ اس لیے وجود کی اہمیت سے انکار نہیں دوسری اہم بات سچائی ہے۔ کرکیگارڈ نے سچائی کو موضوعیت (Subjectivity) کا نام دیا ہے۔ سچائی ذات کی گہرائی میں موجود ہوتی ہے جو آزادی کی طرف پیش قدمی ہے لیکن مکمل اور معتبر وجود کے ساتھ ایسا فیصلہ کرنا جس سے فرد کی آزادی اور احساس ذمہ داری برقرار رہے آجکل کی سائنسی ترقی نے انسان کو مشینوں کا غلام کر دیا ہے۔ جس سے جنم لینے والی لایعنی کیفیت اور تنہائی فرد کی خودی اور وقار کے لیے زہر قاتل ہے یہ ترقی فرد سے تمام شخصی احساسات کو چھین کر اسے بے رحم تنہائی کے حوالے کر دیتی ہے جو انسانی شخصیت کی نفی ہے۔ تیز رفتار سائنسی ترقی اور دولت کی ریل پیل بھی فرد کی مابعد الطبیاتی حدوں سے دوری کے خلا کو پُر نہیں کر سکتی۔

مذہب، تہذیب، زبان وادب، فلسفہ اور اخلاقی قدریں زندگی کی روح ہیں ان کے بناوجود کا تصور ممکن نہیں۔ لیکن اس کا مطلب ہر گز نہیں کہ انسانی وجود ان کا غلام ہو بلکہ یہ وہ بنیادیں ہیں جو فرد کو اپنے وجود سے روشناس کراتی ہیں۔ لیکن جدید نظام نے یہ تمام بنیادیں چھین لی ہیں۔ پہلے پہل سائنسی انقلابات کی روشنی نے فرد کی آنکھوں کو خیرہ کیا لیکن اس تیز روشنی کے ختم ہوتے ہی فرد مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا۔ آوازو ترسیل کے سبھی روابط جو مذہب واخلاقیات سے جڑے تھے ٹوٹ گئے۔ علامتیں بدل گئیں۔ خدا کے جو معنی ابن عربی اور ملٹن دانتے کے ہاں تھے وہ ایلیٹ اور نطشے کے ہاں نہ رہے۔ کرکیگارڈ کے پاس جو سچ کے معنی تھے وہ پال اور سارتر کے ہاں نہیں تھے۔ سب کے ہاں خدا اور مذہب کے معنی الگ الگ ہیں۔ ان کو پرانے معنی کی طرف لوٹانا ایک ناگزیر کوشش ہے۔۔ڈاکٹر حیات عامر حسینی اپنی کتاب "وجودیت" میں رقمطراز ہیں:

> "وجودیت کی کوئی بھی واضح تعریف نہیں کر سکتے کیونکہ تعریف کا مطلب جوہر کا بیان ہے اور وجودیت انسان کے کسی بھی جوہر کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں"(۳)

اس صورتحال میں وجودیت کے معنی ومفہوم کو بیان کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ وجودی نقطہ نظر سے بھی ممکن نہیں کیونکہ تعریف "جوہر" کی ہوتی ہے اور وجودیت "وجود" سے قبل کسی بھی انسانی جوہر کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ فلسفہ وجودیت ہر قسم کے عقلی، تجریدی اور منطقی فلسفے کی نفی کرتا ہے۔ یہ ایک منفرد طرز زندگی ہے جس میں فرد کی زندگی کا دارومدار اس کے ذاتی تجربے، حقیقی مشاہدے اور عمل پر مبنی ہوتا

ہے۔ یہ فرد کی انفرادی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جس میں وہ اپنے تمام تر شعور کے ساتھ بنا کسی قید اور پابندی کے زندگی گزار سکے۔ یہ عقلیت اشتراکیت اور فسطائیت کے خلاف احتجاجی آواز ہے وجودیت کسی متعین کردہ نظریے یا مفروضے کا نام نہیں ۔ اس کے حق میں اور متضادات الگ الگ نظریات و تصورات موجود ہیں۔ جنھیں باہم ملا کر کوئی حتمی رائے دینا ناگزیر ہے۔ وجودیت فرد کی انفرادیت پر اصرار کرتی ہے اور اس کے جذبی پہلوؤں پر بحث کرتی ہے۔

دنیا کی تمام اشیاء کی تعریف ان کی خصوصیات کے پیش نظر کی جاتی ہے جو اسے دوسری اشیاء سے منفرد بناتی ہیں۔ اس طرح کوئی بھی تحریک ہو یا فلسفہ اس کی بھی چند خصوصیات ہوتی ہیں۔ ذیل میں ہم فلسفہ وجود کی چند نمایاں خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔

وجودیت کی پہلی خصوصیت اس کی حیرت انگیز کیف آوری ہے دنیا کی سبھی اشیاء کی مخصوص خصوصیات ہو سکتی ہیں لیکن فرد کو طے شدہ معیار پر کھنا ناممکن ہے کیونکہ فرد اپنی زندگی کو نئے امکانات کی دنیا کے سپرد رُکر کے نت نئے راستوں کی تلاش کرتا ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں فرد پہلے اپنے وجود اور بعد ازاں جوہر کا سہارا لیتا ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ فطرت سے نبرد آزما ہو کر اپنے جوہر کا انتخاب خود کرتا ہے۔ وجودیت فطرت کی نفی بھی اس لیے کرتی ہے کہ فطرت ایک لگے بندھے مکمل نظام کا نام ہے۔ جبکہ فرد کو امکانات کی دنیا میں نئے نئے رجحانات سے متعارف ہونا پڑتا ہے۔ فرد کسی مخصوص رویے یا پابندی کا قائل نہیں ہے انسان پہلے اپنی ذات کا سامنا کرتا ہے پھر کائنات سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

وجودیت کی دوسری خصوصیت اس کی انفرادیت اور یکتائی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فرد کسی صورت کسی دوسرے فرد مماثلت نہیں رکھتا۔ فرد اپنے مشاہدے ، تجربے اور عمل کی بنیاد پر اپنی راہیں خود متعین کرتا ہے۔ اس معاملے میں وہ مکمل خود مختار اور آزاد ہے۔ ہر فرد کا رویہ، اقدار اور امکانات دوسرے فرد سے مختلف ہیں۔ مختلف دنیائیں ہیں ہر فرد اپنی ذاتی دلچسپی کی دنیا میں رہنے کے لیے آزاد ہے۔ دوسری انفرادی بات کے دنیا کی دیگر ٹھوس اشیاء کے لیے وجود کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دیگر مخلوقات کے لیے یہ انفرادی خصوصیات اہم نہیں اس لیے یہ اصطلاح ان کے لیے استعمال نہیں کی جا سکتی۔

وجودیت کی تیسری خصوصیت اس کا باشعور اور خود آگاہ ہونا ہے۔ فرد نہ صرف خود آگاہ ہوتا ہے بلکہ اس لحاظ سے وہ دوسروں سے بھی منفرد اور ممتاز ہوتا ہے۔ وجودی مفکرین کے ہاں سچائی اور موضوعیت بنیادی مسائل ہیں لہذا فرد اپنے وجود کی روشنی میں وہ ان مسائل کو پرکھتا ہے اور امکانات کے لئے جدوجہد کرتا ہے

یعنی عرفان و آگہی کے سفر میں محور و مرکز اپنی ذات کو بتاتا ہے۔ اثبات کی تلاش فرد کو اس وقت سے تھی جب وہ صنم پرست تھا یہی وہ تلاش تھی جس نے انسان کو ارتقا حرکت اور تغیر سے روشناس کرایا وہ امکانات کی تلاش میں کئی منزلوں سے گزرا آگہی کا یہ سفر مافوق الادراک ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں

"یہ فلسفہ دراصل ان مروجہ اور روایتی فلسفوں کے خلاف ایک رد عمل تھا جن میں فلسفہ اشیاء اور خیالات کا مرکز بن کر مجرد اور بے جان بحثوں میں الجھ کر رہ گیا تھا وجودیت نے لوگوں کو محسوس کرایا کہ داخلی رویہ خارجی حقیقت کو بدل سکتا ہے"(۴)

وجودیت کی چوتھی اور اہم خصوصیت فکر آزادی ہے۔ آزادی سے مراد To Exist کی کیفیت ہے یعنی فرد کسی پابندی کے بنا اپنے تمام تر شعور کے ساتھ ایک آزادانہ زندگی بسر کر سکے۔ جب کہ زندگی کے نئے امکانات کے لیے ہمہ وقت فیصلہ لینا فرد کی مجبوری ہے اپنی بقا کے لیے اسے اپنے فیصلوں میں خود مختار ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح اس کی آزادی اس کے لئے ایک سزا بھی ہے۔ لیکن یہ آزادی اس کی بقا کی خود مختاری اور احساس ذمہ داری کے لیے اہم ہے۔ بعض اوقات اس کے اعمال اس کی بقاء کی ضمانت بن جاتے ہیں یعنی فکر و عمل کی آزادی وجود کے لئے لازمی ہے۔ یہی موضوعی سچائی ہے اور اس کے بنا وجود کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ اپنی تلاش میں سرگرداں فرد خود سے کئی سوال کرتا ہے جن کے جواب اسے اپنی ذات کے نہاں خانوں سے ہی ملتے ہیں۔ فلسفہ وجودیت "اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی کی عملی صورت ہے۔

وجودیت کی ایک اور اہم خصوصیت " انتخاب یا فیصلہ " ہے ۔ زندگی امکان سے بھرپور ہے یہ وہ صورتحال ہے۔ جس میں فرد اپنے انتخاب یا بروقت فیصلے کے ذریعے عرفان ذات حاصل کرتا ہے انسان اس طرح ہر وقت حالات و واقعات اور نت نئے امکانات کی زد میں رہتا ہے۔ امکانات کی یہ لامحدود دنیا وجود کو اپنے آپ سے آگاہ ہونے کے مواقع فراہم کرتی ہے انتخاب ایک ایسا لمحہ ہے جس میں فرد اپنی سچائی موضوعیت اور آزادی پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی ذات کے نہاں خانوں میں جھانکتا ہے اور اپنے اندر قوت فیصلہ پیدا کرتا ہے۔ فیصلے کے بنا انتخاب ممکن نہیں ہے یوں انتخاب اور شعور ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں دوسری اہم بات وجود کسی بھی طے شدہ اچھائی کو فوراً قبول نہیں کرتا بلکہ اس کا انتخاب خود بخود اس اچھائی میں ڈھل جاتا ہے۔ فرد نہ صرف اپنا راستہ خود منتخب کرتا ہے بلکہ اپنی اخلاقی قدریں بھی خود تشکیل دیتا ہے۔

ii۔ سماجی و فلسفیانہ پس منظر

عہد کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ انسانی فکر میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کسی بھی عہد کی حقیقی ترجمانی اور عکاسی کا کام ایک فلسفی ہی کر سکتا ہے۔ یعنی یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ فلسفے کا تعلق اپنے سماج اور عہد سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی زمانوں اور علاقائی وسعتوں پر کیوں مشتمل نہ ہو کسی بھی فکر یا نظریے کی تفہیم کے لیے اس عہد کے سماجی اور فلسفیانہ منظر نامے کو جاننا لازم ہوتا ہے۔ فلسفہ وجودیت کا باضابطہ آغاز تو انقلاب فرانس کے بعد ہوتا ہے لیکن درحقیقت انسانی زندگی کے آغاز سے ہی فرد وجود کی شناخت اور انفرادیت کے مسائل سے دوچار رہا ہے۔ چنانچہ فلسفہ وجودیت کو سمجھنے کے لئے سیاسی، سماجی، مذہبی حالات و واقعات، ثقافت، انقلابات اور جنگوں سائنسی دور اور قدیم فلسفوں کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے

سماج کے مطالعے کا علم سماجیات کہلاتا ہے۔ اس علم میں ماحول کے اثرات مسائل اور حقیقتوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک اپنے ماحول سے جڑا رہتا ہے اس کی عادات و اطوار کے اختیار کرنے میں سماج کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا درست ہو گا کہ وہ اپنے موجودہ سماج کے اصول و قواعد کا پابند ہوتا ہے۔ سماجیات میں انسان کی سیاسی، معاشی، مذہبی، اخلاقی اور تمدنی زندگی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ کسی بھی تحریک نظریہ یا فلسفہ کو سمجھنے کے لئے اس عہد کے سماجی حالات سے واقفیت لازمی ہے۔ اس طرح ادب کو سماجی اور تہذیبی حوالے سے پرکھنا یا کسی بھی عہد کے سیاسی، تہذیبی اور سماجی پہلوؤں کا مطالعہ "ادبی سماجیات" کہلاتا ہے۔ جس کی بدولت ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کا منظر نامہ کیا تھا؟ سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات کیسے تھے؟

فلسفہ وجودیت کا باضابطہ آغاز انیسویں صدی میں انقلاب فرانس سے ہوتا ہے۔ انقلاب فرانس کے اسباب پر غور کرنے اور اس کے نتائج کو سمجھنے کے لیے طرز حکومت اور سیاسیات کا تذکرہ لازم ہے۔ جب چند افراد بلا خوف و خطرہ ریاست میں اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہوں تو یہ نظام مستند نظام حکومت کہلاتا ہے۔ ایسی حکومت کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ عوام الناس پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے مذہب کو اپنے زیر نگیں رکھے۔ رعایا کو جہالت میں رکھا جائے۔ افراد معاشرہ فکر آزادی سے بے بہرہ ہوں۔ نوجوان نسل کو اوصاف حمیدہ اور اخلاق سے پرے ذلت و خواری کی طرف دھکیل دیا جائے۔ عوام کو بنیادی سہولیات اور اراضی سے محروم رکھا جائے۔ خدا کو کوئی ان دیکھی طاقت مان کر بادشاہ کو اس کا نائب تصور کیا جائے۔ غرض یہ کہ مکمل طور پر مفلوج زندگی رہے یہ مستند حکومت کا حکم تھا۔

اہل فرانس صدیوں اس نظام کا شکار رہے۔ تعلیم سے دور عوام صدیوں تک بادشاہ کی اطاعت کو خدا کی اطاعت سمجھتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں پادریوں اور امراء کی اطاعت بھی لازم تھی۔ بادشاہوں سے یہ توہین برداشت نہ ہوئی تو انہوں نے پادریوں اور امیروں کے اختیارات حذف کر لیے۔ اب تنہا بادشاہ توجہ اور اطاعت کا حقدار ٹھہرا۔ تعلیم یافتہ اور فکر رکھنے والے طبقے نے پہلے کلیسا اور امارات کے ایوانوں کی سرکوبی کی۔ بعد ازاں بادشاہت کو ختم کرنے کا منصوبہ زیر غور آیا۔ بادشاہ کی اطاعت کی صورت عوام کو مطمئن نہ کر سکی۔ عوام نے اپنے اندر کی محرومی کے اسباب کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش ادیبوں اور فلسفیوں کی بدولت ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ اس دور کی انقلابی تحاریر کا ذکر آج بھی ہر انقلابی کی زبان پر ہے۔ ایک نظریاتی دور کا آغاز ہوا۔ لوگ کتابوں کی طرف مائل ہوئے۔ عدل و انصاف اور دولت کی تقسیم کے مسائل پر غور و فکر ہونے لگا۔ مانیسکو، والیٹر، دیدارو اور روسو کے نظریات نے فرانسیسی نوجوانوں کی سوچ کو بدل دیا۔ مانیسکو کے نظریات نے فرانس میں فلسفیانہ تحریک کی ابتداء کی۔ والٹیر ز اٹھارویں صدی کا بڑا نام اور اہم فلسفی ہے۔ اس کے دس ہزار خطوط اور ایک سو کے قریب کتابیں موجود تھیں۔ وہ متوسط طبقے کے دل میں حکومت اور مذہب سے بیزاری پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ وہ انقلاب اور بغاوت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکا لیکن اس کی کاوش سے تحریک کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ دیدارو ایک اور شاندار شخصیت جس نے مستند ڈرامے اور ناول لکھے۔ دیدارو کی کاوش نے تقلید اور قدامت پرستی کا خاتمہ کیا۔ روسو کا نظریہ بھی اس کی ذہنی فکر کا نتیجا ہے۔ روسو اٹھارویں صدی کا نمایاں نام اور جدید فرانسیسی ادب کا بانی ہے۔ روسی ادبیات پر اسکی گہری چھاپ ہے۔ روسو نے فن کو ادب، روح کو فلسفے اور نفسیات کو سیاسیات میں شامل کیا۔ اس کے نظریات نے عوام میں ایک شعور اور اضطراب کی کیفیت کو جنم دیا۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ انقلاب فرانس کا باعث فرانس کی اقتصادی بدحالی تھی۔ مگر اس کے علاوہ بھی کئی اسباب تھے۔ ۱۷۹۳ سے ۱۷۹۴ تک ہزاروں افراد انقلاب کی خاطر اپنی جان گنوا بیٹھے ۸ جون ۱۷۹۵ کو ولی عہد فرانس کو قتل کر دیا گیا۔ مئی ۱۸۰۴ میں نپولن بوناپارٹ نے اقتدار سنبھالا:

> "انقلاب کے زمانے میں فرانس کی حالت بدل گئی تھی انقلاب کا آغاز میں ۱۷۸۹ میں ہوا جولائی ۱۷۹۴ کو قتل ہوا۔ اس دوران فرانس کی دیہاتی آبادی میں بڑا تغیر رونما ہو چکا تھا۔ کسان مالکان اراضی کی ایک

جماعت بن چکے تھے۔ جاگیر دارانہ زمیندار ختم ہو چکے تھے۔ فرانس کے
کسان اس سے زیادہ انقلاب نہیں چاہتے تھے وہ مطمئن تھے"۔ (۵)

فرانس کا فرسودہ نظام بد نظمی کی بدولت تباہ ہوا۔ ساری بد عنوانیوں کی وجہ چرچ تھا۔ ایلیٹ کلاس مفلوج ہو چکی تھی۔ معاشی نظام شدید بدحالی کا شکار تھا۔ جس کی بدولت عوام میں انتشار کی کیفیت نے جنم لیا۔ یہ تمام وجوہات کسی بھی انقلاب کی طرف جانے کے لیے کافی ہیں۔ انقلاب کے طویل دورانیے میں فرانس کن مراحل سے گزرا کون سی فوجی مہمات ہوئیں؟ یہ ایک الگ داستان ہے جس پر تاریخ نویسوں نے بے شمار کام کیا ہاں انقلاب فرانس نے دو ادوار کے درمیان ایک واضح خط کھینچا۔ فرسودہ روایات نے دم توڑ دیا نئے انسان نئی روایات اور نئے افکار نے جنم لیا۔ نئی دنیا میں سبھی کچھ یکساں میسر تھا۔ سکون اور بے چینی، سہولیات و خطرات اور خوف و تسکین جیسے رجحانات ساتھ موجود تھے۔ ۱۸۱۵ سے ۱۸۵۰ تک فرانسیسی انقلاب نے مغرب میں ہلچل مچائے رکھی۔ حالانکہ انقلاب فرانس سے قبل بھی دو انقلابات آئے۔ امریکہ جنگ آزادی اور صنعتی انقلاب جس نے نو آبادیات کی بنیادیں ہلا دیں۔ زرعی دنیا بری طرح متاثر ہوئی صنعت کو فروغ ملا۔ لیکن ان انقلابات کے برعکس انقلاب فرانس زیادہ پر اثر رہا۔ کیونکہ اس نے مذہبی اقدار فرسودہ روایات اور بے جا پابندیوں سے سماج کو نجات دلوائی اور اس کی جگہ روشن خیالی اور آزادی کی ترغیب دی۔ یوں ایک وجودی فرد کی شناخت کا دور شروع ہوا۔ بادشاہ اور چرچ کے دبدبے سے آزاد ہو کر فردِ واحد نے اپنی خوشی اور آزادی کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

انسانی تاریخ کا دامن جنگ و جدل اور انسانی خون ریزی کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ پتھر کے دور سے لے کر آج کی جدید دنیا کے منظر نامے پر سرسری نظر ڈالی جائے تو تاریخ کی سب سے بھیانک اور عالمگیر جنگیں گزشتہ صدی میں ہوئیں۔ جن کے اثرات موجودہ دنیا پر آج بھی پائے جاتے ہیں۔ جنگ عظیم اول بیسویں صدی کا دل خراش تنازعہ ہے جو ۲۸ جون ۱۹۱۴ سے شروع ہوا۔ اور ۱۹۱۹ کو اختتام پذیر ہوا۔ یہ جنگ مختلف محاذوں پر سالہا سال جاری رہی۔ اس جنگ میں برطانیہ، فرانس، سیریا، روس امریکہ ایک طرف جبکہ جرمنی، آسٹریلیا، ہنگری، سلطنت عثمانیہ اور بلغاریہ اتحادی قوتیں تھیں۔ یہ جنگ ساری انسانی آبادی اور زندگی کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی جس کے نقصانات اور اثرات پوری دنیا پر پڑے۔

"ساڑھے چار سالہ کشت و خون کے بعد جنگ عظیم اول کا اختتام ہو گیا
مگر یہ ساڑھے چار سال تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ کروڑوں

خاندان سوگوار ہوئے ،لاکھوں لاپتہ، لاکھوں بے گھر اور لاکھوں اپاہج
ہوئے۔ زمینیں بنجر اور بارود زدہ ہو گئیں۔ معیشت تباہ حال ہو گئی۔ بے
حسی عام ہو گی اور اپنی ذات سب سے اہم اور مقدم گردانی گئی"۔ (۶)

جنگ عظیم اول کے فوری اسباب پوری زمینی و فضائی بالادستی کی خواہش معاشی و اقتصادی کامیابی کی دوڑ، باہمی رقابتیں، اتحادی، سیاست، حکمرانوں کا غیر ذمہ دارانہ رویہ صنعتی دوڑ اور نو آبادیاتی نظام کی دوڑ میں شریک ہونے کی خواہشات پر مبنی تھے۔ ساڑھے چار سال تک جاری رہنے والی اس ہولناک جنگ نے تاریخ پر انمٹ نقوش اور اثرات مرتب کیے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے گئے، کروڑوں لوگ سوگوار ہوئے، لاکھوں لاپتہ اور بے تحاشہ افراد معذوری کا شکار ہوئے۔ زمین بنجر اور بارود زدہ ہو گئی۔ معیشت تباہ ہوئی۔ بچے اور کچھ لوگ نفسیاتی مریض ہو گئے۔ انسانی ذہن اس قدر تباہی اور خون ریزی دیکھ کر ماؤف ہو چکا تھا۔ خوف دہشت اور کرب کی کیفیت نے انسانی وجود کو جکڑ رکھا تھا۔ مذہب سے اکتاہٹ، رائج معاشی و اقتصادی نظام سے بغاوت و بیزاری، سیاسی عدم استحکام، بھوک، افلاس اور بے روزگاری نے عوام کو احساس عدم تحفظ کی طرف دھکیل دیا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ فلسفہ وجودیت کی مزید توسیع جنگ عظیم اول کے دوران ہوئی۔ جنگ کے دوران پیدا ہونے والے معاشی سیاسی معاشرتی مذہبی اور تہذیبی انتشار نے خوف مایوسی اور لایعنیت کے احساسات کو جگایا۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے پیاروں کو مرتے دیکھا۔ اپنے گھر تباہ ہوتے دیکھے بارود اور انسانی خون کی بو آسمان سے برستی آگ اور اشیائے ضرورت کی قلت لیکن ان سب سے بڑھ کر موت کا خوف تھا۔ جس نے انسان کو خوف زدہ کر رکھا تھا اس جنگ کا اختتام اجتماعی موت اور خوفناک تباہی پر ہوا افلاس خوف اور تباہ حال معاشی نظام نے زندہ بچنے والے انسانوں کو سینکڑوں مسائل کی طرف دھکیل دیا۔

پہلی بڑی جنگ کے خاتمے پر کہا گیا کہ یہ جنگ اپنی تمام تر تباہیوں کے ساتھ ختم ہو گئی۔ لیکن یہ محض باتیں تھیں۔ سارے دعوے بے معنی ثابت ہوئے۔ لوگ ابھی پہلی جنگ کے خوف اور نقصان سے نہیں نکلے تھے کہ جاپان نے ۱۹۳۹ میں منچوریا پر حملہ کر دیا۔ یوں ایک اور خوفناک جنگ کا آغاز ہو گیا جسے جنگ یورپ یا جنگ عظیم دوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جنگ عظیم دوم کے اسباب میں معاہدے ورسائے، ہالوکاسٹ نازی ازم اور ہٹلر کی بڑھتی ہوئی طاقت تھی۔ پولینڈ جرمنی پر حملہ آور ہوا تو دوسری طرف برطانیہ نے بھی اعلان جنگ کر دیا۔ اس بدترین ایٹمی جنگ میں امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم

گرائے۔ آخر کار ۱۹۴۵ میں اطالوی عوام نے مسولینی کو پھانسی دلوائی اور ہٹلر نے خودکشی کرلی تو یہ جنگ اپنے اختتام کو پہنچی۔ کتاب طوفان سے ساحل تک میں اس وقت کی صورتحال کچھ یوں بیان کی گئی ہے:

"جنگ عظیم کے دھوئیں کے ہولناک بادلوں اور تباہ کاریوں سے لیکر چھوٹی چھوٹی جنگوں کا کوئی شمار نہیں۔ انقلابات اور جوابی انقلابات اقتصادی اور معاشرتی پریشانیوں جو اس زمانے کی سب پریشانیوں سے بڑھ کر تھیں۔ ان تمام ہولناک واقعات نے یہ حقیقت ظاہر کردی کے فنی، صنعتی اور مادی ترقی پر مغرب کی ساری زورآزمائی موجودہ انتشار اور بدنظمی میں ذرا بھی کمی نہ کرسکی۔"(۷)

دوران جنگ لوگوں کے پاس جنگ کے سوا کوئی اور موضوع نہ تھا جس کے بارے میں وہ سوچ سکیں۔ گلیاں اور بازار سنسان پڑے تھے پہلی جنگ عظیم میں کام آنے والوں کی نسلیں دوسری جنگ عظیم میں کام آئیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے انسانی زندگی کو خوف اور کرب میں مبتلا کردیا۔ انسانی زندگی حیوانات اور وحشی پن کی انتہا پر تھی اور انسانیت دم توڑ چکی تھی۔ ہر طرف ناامیدی ومایوسی، کرب، خوف اور دہشت کی فضا مسلط تھی روایتی اقدار نے دم توڑ دیا۔

لوگوں نے جو موت کا بھیانک کھیل دیکھا اس نے باقاعدہ ایک رد عمل اور بعد ازاں ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ انسانی ذہن میں مستقبل کی سبھی امیدیں دم توڑ گئیں۔ لوگ خدا اور مذہبی اقدار سے منہ موڑ گئے۔ سوائے اپنی ذات اور وجود کے کوئی بھی قابل بھروسہ نہ رہا۔ ایک وجود انسانی تھا جو شک سے بالاتر تھا۔ چنانچہ انسان نے اپنے ہی وجود کو بنیاد بنا کر مسائل زیست کو سلجھانے کی سعی کی۔ بے دریغ قتل انسان فرد کی اہمیت وقدر کو بڑھادیا۔ اس احساس نے فروغ پایا کہ انسان قیمتی ہے وہ اپنے وجود کے سہارے نئی راہیں تلاش کرسکتا ہے۔ لوگوں کا رجحان داخلیت کی طرف ہوگیا لیکن یہ اپنی محرومیوں اور خوف سے بچنے کی ایک راہ تھی یوں اس تلخ اور کڑوی حقیقت نے وجودیت کو ایک تحریک کی صورت اجاگر کیا فرد نے اپنے اندر کے خوف سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنے داخلی شعور کا سہارا لیا اور دوبارہ اپنی ذات کی پہچان کی طرف گامزن ہوا۔

مذہب کے لغوی معنی راستہ یا طریقہ کے ہیں مذہب انسانی زندگی کا ایک تصور ہے جس پر زندگی کے تمام پہلو محیط ہیں۔ آج سے دو صدی قبل کا انسان مذہب کی روشنی میں سانس لے رہا تھا تمام قوانین اخلاق رسوم رواج پر آخری سند مذہب کی تھی۔ بادشاہ اور حکمران خدا کے نائب تصور کیے جاتے تھے دنیاوی زندگی کو

آخرت کی تیاری کے لئے گزارنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ حالات پر انسان کا اختیار نہیں۔ خوشی، غمی، صحت موت، پیدائش اور رزق سب خدا کے ہاتھ میں ہے اور انسان کو اپنی تقدیر پر صابر رہنا چاہیے ان تمام اعتقادات کی بنیاد مذہب پر تھی۔ ڈاکٹر وحید عشرت اپنے مضمون ژاں پال سارتر میں لکھتے ہیں:

> "یورپ میں عیسائیت کا رفتار زمانہ نہ چل سکنا اور کلیسا اور ریاست کی علیحدگی تھی۔ مذہب نجی بن گیا اور اجتماعی زندگی کو چلانے والا کوئی نظام اور نظریہ نہ رہا۔ عیسائیت تیزی سے تبدیل ہوئی عالمی اور انسانی صورت کا ساتھ نہ دے سکی"۔ (۸)

بیسویں صدی پر آشوب صدی تھی جس نے دنیا کے نظام کو یکسر بدل دیا۔ کئی انقلابات اور جنگوں نے جنم لیا مذہب بھی اس بغاوت سے محفوظ نہ رہ سکا۔ مذہب کے زوال کا بڑا سبب جنگ خون ریزی انقلاب فرانس حکومتیں، کلیسا کی اجارہ داری اور معاشی بدحالی تھی۔ دو عالمی جنگیں جن میں لاکھوں بے گناہ افراد مارے گئے۔ سائنس کی اشاعت و ایجادات نئے مذہب کی ساکھ کو بہت نقصان پہنچایا۔ مذہب نے انسان کو جن اقتدار میں جکڑ رکھا تھا سائنس نے اسے آزادی خود انحصاری کی راہ دکھلائی۔ سائنس کی پیدا کردہ مادی تبدیلیوں اور آسائشوں نے انسانی دنیا کو نئی امیدیں دیں۔ اس نے جنت کا خیال ترک کر دیا کیونکہ سائنس نے اسے زمین پر ہی جنت کی تمام آسائشیں مہیا کر دیں۔ سائنس کی بڑھتی ہوئی دریافتوں نے مذہبی کتب اور اعتقادات پر نقطہ چینی کی راہ ہموار کی۔ مذہب کے رکھوالے اور کلیسا پوپ اور پادری اپنی زبانی تبلیغ اور تعلیمات کو زیادہ عرصہ تک قائم نہ رکھ سکے۔ اس کی بڑی وجہ ان کے قول و فعل میں تضاد تھا۔ عوام نے عمیق نظری سے مذہب کا مطالعہ کیا تو انہوں نے مذہب کے ٹھیکیداروں کو اخلاقی اور روحانی لحاظ سے خالی پایا۔ نئے دور کے انسان نے مذہب کو تنگ نظر اور نفرت کا سرچشمہ قرار دیا۔

یورپ کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ مذہب اور عقیدے کا زوال تھا۔ مذہب کو زندگی میں کوئی مرکزی حیثیت نہ دی گئی۔ اس کی اہمیت خارجی آداب اور رسم و رواج تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔ لوگ مذہب سے دلبرداشتہ ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ خدا کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ ملحدانہ وجودیت کا نقطہ آغاز تھا مذہب کے زوال نے اخلاقیات کا دیوالیہ نکال دیا۔ جب خدا ہی نہ رہا تو اس کے بنائے ہوئے قوانین کی بھی کیا حیثیت۔ مذہب سے بیزاری اور مروجہ قوانین و اقدار سے روگردانی نے عوام میں روحانی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت کو جنم دیا۔ کرب اور مصیبت میں اضافہ ہوا۔ انسانی ذہن میں اٹھنے والے سوالات کا کوئی تسلی بخش

جواب نہ مل سکا۔ مادیت کے کئی نئے فلسفے ایجاد ہوئے۔ جس سے معاشی اور اقتصادی صورتحال تو بہتر ہوئی لیکن روحانی تشفی ممکن نہ تھی۔ مذہبی علماء اور صالحین نے اپنے عہد کی اخلاقی حالات سدھارنے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح ناکام رہے۔ کیونکہ اخلاقی سطح پر بڑی تبدیلی آچکی تھی اس کشمکش کے دور میں ہر فرد وجود کی سطح پر انتشار کا شکار ہوا اور دنیا و مافیا سے بے خبر اپنی ذات کے بکھراؤ کو سمیٹنے کی داخلی کوشش کرنے لگا۔ وہ وقت اور حالات کے مطابق خود کو بدلتا رہا۔

> "بیسویں صدی کے ابتدائی سال اس لحاظ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک روحانی خلا پایا جاتا ہے۔ وہ ساری اخلاقی اور روحانی قدر جن سے یورپ صدیوں سے آشنا تھا۔ آپ ان میں سے کسی کی بھی خاص اور متعین شکل باقی نہیں رہ گئی تھی۔"(۹)

اخلاق ایک پہاڑی چشمے کی مانند ہے جو انسان کے باطن سے پھوٹتا ہے اور اس کے رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے۔ مذہب سے دور رہ کر بھی نیکی اور اخلاقیات ہمیشہ فرد کی اولین ترجیحات میں شامل رہیں۔

مذہب کی گرفت جس قدر مضبوط تھی عالمی جنگوں کے بعد اس قدر ہی کمزور ہوئی۔ اندھے اعتقادات کا دور ختم ہوا۔ مذہب چرچ تک محدود ہو گیا۔ فرد کی عملی زندگی میں اس کا عمل دخل قدرے کم ہو گیا۔ انیسویں صدی میں کئی مفکرین آئے جنھوں نے خدا کے وجود پر سوالات اٹھائے انہیں آسمانی خدا کی بجائے کسی ایسے خدا کی تلاش تھی جو اس عہد کے سماجی کرب و انتشار کا خاتمہ کر سکے۔ فرد کے دکھ کو دور کرے اس کے ذہنی کرب کا بروقت علاج کرے۔ حالانکہ ہر دور میں ایسا الگ گروہ موجود رہا جس نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ خدا کی ذات کو کسی خاص مقام یا جگہ پر تلاش کرنا ممکن ہے۔ وہ آسمانوں پر موجود ہے اور انسانی زندگی کا محاسبہ کرتا ہے۔ یوں خدا کے ماننے اور نہ ماننے والوں کے دھڑے بنتے گئے۔ لادینیت کے تصور نے انسانی زندگی میں اضطراب پیدا کر دیا۔ انسانی ذہن شکوک و شبہات کا منبع بن گیا۔ فرد کی سوچ بیک وقت کئی راستوں پر گامزن تھی۔ عرفان الٰہی کی کھوج شروع ہوئی تو اس سفر میں جو پہلی چیز فرد کے سامنے آئی وہ اس کا اپنا وجود تھا۔ عرفان ذات کے احساسات فلسفہ وجودیت کی پہلی کڑی ثابت ہوئے۔ یوں فرد نے پہلی بار انفرادی طور پر اپنے تمام تر مسائل پر سوچنا شروع کیا اور اپنے شعور و آگاہی کے بل بوتے پر آزادانہ سوچنے اور جینے کا فیصلہ کیا۔ وجودیت اس دور کے سماج اور مذہب کے خلاف ایک احتجاجی آواز کے طور پر سامنے آئی۔

سائنس حقیقت کا جزوی علم ہے یہ دنیا کے مطالعے کا نام ہے جو مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ سائنس کے علم کے عروج کا زمانہ بھی اٹھارویں اور انیسویں صدی ہے۔ جب سائنس اور مذہب کا تکرار ہوا تو جدید سائنسی علوم کا ظہور ہوا سائنسی علوم نے خدا، الہامی کتابوں اور اعتقادات پر کئی سوالات اٹھائے۔ انسانی زندگی یکسر بدل گئی الہام پر منطق کو ترجیح دی گئی ماضی کی تقلید اور اندھے اعتقادات کے دن گئے۔ انسان کی نظر روشن مستقبل پر تھی۔ سائنس کی عمارت تجربے اور سمجھ پر قائم ہوئی کیونکہ انقلاب فرانس اور دو عالمی جنگوں کے بھیانک دور کے اختتام پر اقوام عالم شدید معاشی اور اقتصادی بحران کا شکار تھیں۔ اقتصادی نقصان کا شمار ممکن نہ تھا اس پر اجڑی ہوئی انسانی بستیاں شدید محرومی اور مایوسی کو جنم دے رہی تھیں۔ ایسے میں تمام تر قوت اور کوشش اقتصادی اور معاشی نظام کو بہتر بنانے پر صرف کی گئی مادیت کے فلسفے اپنے عروج پر تھے۔ سائنس نے بے پناہ ترقی کی۔ سائنسی برق رفتاریوں نے ایک مشینی دور کی بنیاد رکھی جہاں آسائشوں اور نعمتوں میں اضافہ ہوا۔ وہی بدترین ایٹمی ہتھیاروں نے بھی جنم لیا۔ جہاں بے شمار سہولیات میسر آئیں وہیں انسانی بقا کو شدید خطرات بھی لاحق ہوئے۔ ذرائع آمدورفت رسل و رسائل اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کے تمام تر کام مشینوں کے ذریعے انجام پانے لگے۔ گھنٹوں کے کام منٹوں میں طے پانے لگے۔ ڈاکٹر وحید عشرت اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں:

> "میکانیت اور مشینی زندگی میں بہت سے مسائل جنم دیے۔ ان مسائل نے انسان میں ایک مخصوص بے چینی، کشیدگی، تشویش، کھچاؤ اور دہشت کو جنم دیا سائنس نے اگرچہ کبھی انسان کے عمرانی، سیاسی اور اس کے ملی اور ذاتی تشخص کے مسائل کو حل کرنے کا دعوی نہیں کیا تاہم اس کے سب بڑے بڑے اعتقادات ٹوٹ گئے"۔ (۱۰)

سائنسی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ انسان نا صرف مشینوں پر بھروسہ کرنے لگا بلکہ رفتہ رفتہ اس نظام کا غلام بن گیا۔ آدمی آدمی کے لیے اجنبی ہوا رشتوں سے مٹھاس اور اپنائیت جاتی رہی۔ مشترکہ خاندان کی روایات نے دم توڑ دیا۔ جسمانی صلاحیتیں سلب ہوئیں۔ ایٹم بم کی ایجاد نے ساری دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کر کھڑا کیا مہلک ترین ہتھیار بنائے گئے جو انسانی بقا کے لیے بڑا خطرہ ہیں۔ تنہائی اور خوف پوری انسانیت اور اس طرح کی کیفیت نے جنم لیا فطری موت کے امکانات کم ہوئے۔ اس کی جگہ حادثاتی اور اجتماعی موت نے جنم لیا۔ سب سے بڑا نقصان جو فرد کو پہنچا وہ اس کی قدیم اخلاقی اور مذہبی اقدار سے دوری

ہے۔سائنس نے سارے اعتقادات کو بے معنی کر دیا عقل و دانش پر مبنی فلسفہ نے توہم پرستی کے تمام اعتقادات پر اپنی بالادستی قائم کرلی۔ خدا کے وجود سے انکار کرنے پر لوگوں کے دِلوں میں سکون پیدا کرنے کی بجائے شک، اضطراب اور کرب کی کیفیات کو جنم دیا۔ انیسویں صدی میں سائنس دانوں نے بے پناہ کامیابیاں حاصل کیں۔ بعض مفکرین مذہبی مابعد الطبیعات کے مقابلے میں فطری مابعد الطبیعات کا تصور پیش کیا جس کی بنیاد تخلیقی صلاحیتوں پر تھی۔

وجودیت کا فلسفیانہ پس منظر

فلسفہ اشیاء کے معنی اور ماہیت کا مطالعہ ہے۔یہ زندگی کی توجیہہ ہے۔ انسانی افکار و خیالات میں وسعت پیدا کرنے کا سبب ہے یہ حکمت و شعور سے زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ یہ عالم میں موجود ادوار اور زمانوں کو جاننے کی سعی ہے۔ یہ علم و حکمت سے محبت کا نام ہے۔ فلسفہ کل حقیقت سے بحث کرتا ہے۔ یہ ایک استفہامی علم ہے۔ عصری خیالات کو جاننے سے قبل فلسفے کی مربوط تاریخ کو جاننا اہم ہے۔ تمام تر فکری تحریکوں کا جائزہ تاریخ کے مطالعہ سے ہی ممکن ہے۔ وجودیت کو فلسفہ کے تناظر میں دیکھنے سے قبل مختلف ادوار میں فلسفے کے بدلتے ہوئے رجحانات پر ایک سرسری نگاہ لازمی ہے۔ تاریخ فلسفہ کے چار ادوار ہیں۔

۱۔ فلسفہ قدیم ۲۔ فلسفہ قرون وسطی (ازمنہ وسطی) ۳۔ فلسفہ جدید ۴۔ عصری فلسفہ

فلسفہ قدیم کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی قبل مسیح سے لے کر تیسری صدی تک متعین کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں فرد کا دائرہ اور اخلاقیات تک محدود رہا وہ خارجی علوم اور جوہر کی تلاش سے ہوتا ہوا عرفان ذات کا سفر کرتا ہے۔ نفسیات، سیاسیات اور شعریات اہم موضوعات رہے۔ منطق اور اخلاقیات کو اہمیت دی گئی کیونکہ ان کا براہ راست تعلق انسان کے اعمال سے تھا۔ اس دور کے اہم اساسی سوالات میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ انسانی زندگی کے مقاصد کیا ہیں؟ متصادم حالات سے پیدا ہونے والی صورتحال مابعد الطبیعاتی مسائل کو جنم دیا۔ یوں انسانی وجود کائنات کی تخلیق اور خالق و مخلوق کے رشتے کے حوالے سے وضاحت کی کوشش کی گئی۔ انہی موضوعات کو زیر بحث لاتے ہوئے عہد قدیم کے فلسفیوں نے مذہب کے دائرے میں قدم رکھا۔

روحانیت اور مذہبی تصورات کو سمجھنے کے لئے فلسفیوں نے اپنی فکر کا آغاز مطالعہ کائنات سے کیا، جس کی ماہیت کو پرکھتے پرکھتے وہ اس کے بنانے والے کو کھوجنے لگے۔ فلسفہ قدیم میں عقل و شعور کو پہلی ترجیح دی جاتی تھی۔ ان کا کامل یقین تھا کہ فطرت اور کائنات ایک مقرر اور متعین نظام کے تحت اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں اور ان کے پوشیدہ اسرار کو سمجھنے کے لیے عقل و شعور ہی معاون ہوں گے۔ چنانچہ منطق

اور عقل انہیں جس طرف لے جائے وہ اسی راستے پر گامزن ہو جائیں ۔ قدیم مفکرین کے ہاں معاشرہ ایک اجتماعی ادارہ ہے یعنی ریاست کا تصور موجود تھا۔ فرد کی حیثیت ایک جزو کی تھی۔ ریاست بنیادی حیثیت کی حامل تھی۔ اس لیے اس دور میں بھی فرد کے ذاتی مسائل اور انفرادیت کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کی شناخت اور پہچان پر توجہ نہیں دی گئی۔ عقل و شعور کے ہر زاویے نے ریاستی بالادستی اور اجتماعی زندگی کو اولین ترجیح دی۔ اس دور کے اہم فلسفیوں میں اناکسامنڈز، فیثا غورث، ہیراکلائٹس، اناکساغورث، سقراط، ارسطو اور افلاطون کے نام قابل ذکر ہیں۔ فیثا غورس نے کائنات کی تشکیل کے اصول پیش کیے۔ اس کے نظم اور مقصدیت پر غور و فکر کیا۔ سقراط ایک حق پرست فلسفی تھا۔ جس نے اخلاقیات اور فطرت کے حوالے سے ٹھوس دلائل پیش کیے۔ حق پرستی کی یاداشت میں سزا پائی اور زہر پی لیا۔ افلاطون نے مغربی فلسفہ روحانیت، جمہوریت کے قانون، سیاسیات اور ادب سمیت دیگر کئی شعبوں کی بنیاد رکھی۔ آج کی زندگی کے ہر شعبے میں اس کے افکار کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے ۔ ارسطو ریاضی، طبعیات، حیاتیات، حیوانیات اور اخلاقیات کے حوالے سے گرانقدر کتابیں چھوڑ گیا۔ یونانی فلسفیوں نے زندگی کے تمام شعبہ ہائے جات کے لیے ایک راہ متعین کی۔ جس سے تمام ادوار کے فلسفیوں نے استفادہ کیا اور نئے رجحانات کی بازیافت کی۔

فلسفہ قرون وسطی کا زمانہ چوتھی صدی سے لیے کر تیرھویں صدی تک متعین کیا جاتا ہے۔ یہ دور فلسفیاتی موضوعات کی بھرمار کا دور ہے۔ اس دور میں متضاد اور متصادم لہریں آپس میں گڈمڈ ہوتی نظر آتی ہیں۔ قرون وسطی کو مذہبی دور بھی کہا جاسکتا ہے۔ تمام مذہبی تحریکیں اسی دور میں وجود میں آئیں۔ عیسائیت کا عروج اور بعد ازاں اسلام کی روشنی تمام عالم میں پھیلی۔ قرون وسطی کے فلسفے پر مذاہب کی گہری چھاپ ہے۔ اس دور میں خدا کی وحدانیت اور حاکمیت کو ثابت کیا گیا۔ یونانی فلاسفروں کے افکار نے نئی تحریکوں کو دوام بخشا عقل و شعور کی جگہ اعتقادات نے لے لی۔ کلیسا اور اس کے فرمارواؤں کی ہر بات کو حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ انسان مذہب اور اخلاقیات کو اپنی کل کائنات سمجھتا تھا۔ وہ عبادات اور اخلاقیات کو انسانی زندگی کا خاصہ سمجھتا تھا۔ انسان کو کمزور، اس کی فکر کو محدود اور گناہ گار سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ خدا کی ذات طاقتور لامحدود اور اس کا وجود مقدس قرار پایا تھا۔ اس دور کے فلسفی و مفکرین سینٹ آئن سٹائین، سینٹ تھامس، جان ڈنس، ولیم آف آکیم، ابن رشد، الکندی اور ابن سینا وغیرہ تھے۔ آکیم نے مغربی مسحیت کو دوام بخشا، یہ کلیسا کے معلمین کہلاتے ہیں ابن رشد، فاریابی، الکندی، ابن سینا، ابن الغزالی مسلمان مفکرین مسلمان مفکرین بہترین ماہر فلکیات طبیعا دان موسیقی کے نظریہ ساز مرکبات، ریاضیات اور عطریات کے ماہر تھے۔ قرون وسطی میں

مذہبی اعتقدات، کلیسا اور اخلاقیات کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ خود کو کم تر اور گناہ گار سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس کے ذاتی مسائل یہاں بھی نظر انداز ہوتے رہے۔ فرد کے کرب اور لایعنیت سے چشم پوشی اس عہد میں عام رہی۔ اسے گناہ و ثواب سے سزا و جزا اور جنت و دوزخ کے گھمبیر موضوعات میں الجھا دیا گیا۔ جہاں وہ اپنے بارے میں سوچنے سے قاصر رہا۔

فلسفہ جدید کا عہد چودھویں صدی سے انیسویں صدی تک محیط ہے۔ سولہویں سے سترویں صدی تک یورپ سے اٹھنے والی ثقافتی تحریک، نشاۃ ثانیہ نے عالمی سطح پر تمام نظام کو بدل دیا۔ اس تحریک میں فلسفے کے قدیم اور جدید خیالات کو از سر نو تشکیل دیا گیا۔ عالمی جنگوں اور اخلاقیات کے بعد فلسفہ اور ادب کا بین الاسرحد تبادلہ ہوا۔ مغربی علوم مشرق تک پہنچنے اور مشرقی فکر مغرب کے ہاں منتقل ہوئی۔ یہ دور فکر کی دنیا کا انقلابی دور کہلاتا ہے۔ سائنس ادب اور آرٹ کو فروغ ملا۔ سائنسی ایجادات نے اندھی عقیدت اور توہم پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ مذہب اور الہیات کے موضوعات بھی ثانوی حیثیت اختیار کر گئے۔ مطالعہ کائنات اور تسخیر کائنات پر زور دیا گیا۔ کائنات کے پوشیدہ اسرار کھوجنے کی سعی کی گئی۔ اس دور کی بڑی خوبی یہ تھی کہ مذہب، اخلاق، آرٹ، ادب اور سائنس کا الگ الگ آزادانہ مقام متعین کیا گیا۔ فرد کو سوچنے کی آزادی ملی۔ نظریہ قومیت پروان چڑھا۔ انفرادی نقطہ نظر پر توجہ دی گئی۔ اس عہد میں ہر قوم اپنی تہذیب زبان اور ادب سے گہری محبت میں مبتلا تھی۔ مفکرین کو جس موضوع میں کوئی صداقت محسوس ہوئی انہوں نے بلا جھجک اس کا اظہار کیا۔ متعدد نظریات نے جنم لیا کوئی ایک دوسرے کی فکر سے متفق نہ ہوا تو متضاد نظریات نے فرد کو انفرادی طور پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت عطا کی۔ تمام نظریات نے اپنی قوم اور زبان کے حالات و واقعات کے تحت جنم لیا۔ جو کہ خالص ماحول کی پیداوار تھے۔ فرد کو انفرادیت ملی۔ اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا اور وہ پہلی بار بااختیار ہو کر اس راستے پر گامزن ہوا جو اس کی سوچ کے عین مطابق تھا۔ اس دور کے اہم مفکرین بیکن، پالس، ڈیکارٹ، لاک، برکلے، نطشے، شلنگ اور ہیگل تھے۔ اس عہد کا نمایاں نام کی ہیگل ہے۔ اس کے خیالات نصف صدی تک جرمنی کی علمی فضا پر مسلط رہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تمام عصری تحریکیں اور فلسفے ہیگل کے نظریات کا ردعمل تھے۔ جن میں وجودیت قابل ذکر ہے۔

ہیگل کے نظریات نطشے، سیلنگ، ارسطو، اپنی نواز اور کانٹ کے بنائے ہوئے اصولوں پر ہی قائم ہوا۔ انہی کی خامیوں کو دور کر کے ایک نئی سمت کا تعین کیا۔ ان کے نزدیک عقل علم کا اصول ہے اور تمام فلسفے عقل کی روشنی میں ہی نمو پاتے ہیں۔ فطرت عقل کے تابع ہے یعنی ہیگل کا بنیادی خیال انسانی ذہن اور شعور

ہے۔اس نے شعور کو اہمیت دی اور احساس، قوت ارادی اور وجود کو نظر انداز کیا۔ وجودی مفکرین کو ہیگل کے نظریات سے یہی اختلاف تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فلسفہ وجودیت ہیگل کے نظریے کا رد عمل ہے۔ جس نے حد سے بڑھی ہوئی اقلیت کی تردید کی۔

انیسویں صدی سے لے کر اب تک کا وقت عصری عہد کہلاتا ہے۔اس دور میں دبستان ہیگل کے رد عمل کے طور پر کئی تحریکیں اور فلسفے وجود میں آئے جن میں نو ہیگلیت، نظریہ روحیت ،عملیت پسندی، حقیقت پسندی، اشتراکیت، تجربیت، رومانیت اور وجودیت قابل ذکر ہیں۔نوہیگلیت، بریڈلے، سنکوئٹ، ٹی ایچ گرین کے نظریات پر مبنی ہے۔ نظریہ روحیت کا علمبردار برگساں ہے۔

حقیقت پسندی کے فلسفے میں ہربرٹ فور فریڈرک اور بالٹ کے نام ملتے ہیں ۔ اشتراکیت ،کارل مارکس اور لینن کے نظریات کا مجموعہ ہے۔ تجریدیت جان ڈیوی کے افکار پر مبنی ہے جب کے وجودیت کے مفکرین میں ہمیں کی کر کیکارڈ، ہائڈیگر، جیسپرز، مارسل ڈیکارڈ، سارتر اور کامیو وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ عصری فلسفے کے مرکزی رجحانات میں موجود کی انفرادیت شناخت کے مسائل سائنسی اثرات اقلیت کی مخالفت پر بحث کی جاتی ہے۔ بیسویں صدی تبدیلیوں کا دوسرا نام ہے۔ یہ صدی فلسفہ اور اس کے طریقہ کار کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوئی ہیگل اور کارل مارکس کے نظریات کا عروج اور پھر ان کا جوابی رد عمل اٹھنے والی آوازیں، لہریں اور تحریکیں جنہوں نے انسانی ذہن کو کئی سوالات دیے۔ ایک وقت تھا مغرب میں صرف دو بڑے مکتب فکر تھے ۔مادیت اور اقلیت لیکن نظریاتی اختلاف نے دیگر کئی موضوعات کو جنم دیا۔ جن میں ایک رد عمل وجودیت کے طور پر ظاہر ہوا۔ وجودیت اقلیت اور جبر کے خلاف ایک اجتماعی آواز کے طور پر سامنے آئی کہنے کو تو یہ جنگ وسائنسی ومذہبی کشمکش کا نتیجہ ہے مگر اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ یہ انسانی وجود کی تخلیق کے ساتھ ہی موجود تھی۔ ہر عہد اور ہر معاشرے میں اس کے اثرات ملتے ہیں۔ ہر وہ عہد اور سماجی انتشار اور اضطراب کی کیفیت موجود ہو وجودی فکر کے ہی زیر اثر جنم لیتی ہے۔ یہ بحرانی دور کی پیداوار ہے۔ اور بحران، انتشار، لایعنیت کی مقصدیت ہر دور میں انسان کے مسائل رہے ہیں لیکن بیسویں صدی میں یہ نظریہ باقاعدہ ایک تحریک اور رد عمل کے طور پر سامنے آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہیں فلسفہ کی صورت اختیار کر گیا کیونکہ جدید دنیا نے انسانی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا تیز رفتار سائنسی ترقی سائنسی ایجادات، انقلاب اور جنگوں کے اثرات مذہب اور روایات کا خاتمہ اور نئی فلسفیانہ تحریکوں نے فرد کو مکمل تنہا اور بیگانہ کر دیا۔ اس صورتحال میں وجودیت انسان کی گم شدہ شخصیت اور شناخت کے مسائل کو لے کر ایک رد عمل کے طور پر سامنے آئی کچھ

مفکرین نے اسے تحریک مکتبہ فکر یا فلسفہ ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ لیکن حقیقت میں یہ واحد فلسفہ ہے جو انسانی زندگی کی بقا اور شناخت کے لیے آواز اٹھاتا ہے۔ فرد واحد کی ذات پر بات کرتا ہے فلسفہ وجودیت ان تمام نظاموں اور فلسفوں کے خلاف اعلان جنگ ہے جنہوں نے انسان کو غلام بنایا۔

iii۔ اہم موضوعات

فلسفہ وجودیت کے مفاہیم و خصوصیات اس کے سماجی و فلسفیانہ پس منظر کے مطالعہ نے وجودی فلسفے کی تفہیم میں مدد کی ذیل میں وجودیت کے باقاعدہ نکتہ آغاز ، وجودیت کی اقسام اور وجودیت کے اہم موضوعات کے حوالے سے گفتگو کی جائے۔

فرد اور وجود کے مسائل نے انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ ہی جنم لیا۔ کیونکہ انسان کو ہر دور میں اپنی بقاء، شناخت اور آزادی کے مسائل نے گھیرے رکھا۔ ان تمام مسائل کے حل کے لئے انسان طاقت کا حصول مذہب کا سہارا اور خود کو منوانے کے لیے کئی جتن کیے۔ جس کے نتیجے میں کئی خون ریز جنگیں ہوئی اور عالمی انقلابات برپا ہوئی۔ یہ جنگیں عالمی منظر نامے پر اپنے بھرپور اثرات مرتب کرتیں رہیں۔ کرب، خوف، انتشار ، اذیت اور لایعنیت ہے جیسے قنوطی عناصر انہی جنگوں اور انقلابات کے نتائج ہیں۔ یوں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ فلسفہ وجودیت بحرانی دور کی پیداوار ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں بحران و انتشار کی کیفیت نے جنم لیا۔

اس عہد اور خطے کے باشعور افراد اس سے متاثر ہوئے اور یہ سلسلہ اس وقت سے لے کر اب تک کسی نہ کسی صورت ہر معاشرے میں چل رہا ہے۔ کوئی بھی فکر ماضی سے اپنا تعلق نہیں توڑ سکتی۔ اس کی جڑیں اپنے ماضی کی زمین میں رہتی ہیں۔ وجودیت بھی اسی فکر پر مبنی ہے۔ زمانہ قدیم کے مفکرین کے افکار و خیالات میں بھی ہمیں وجودی فکر و عناصر پائے جاتے ہیں۔ یونانی مفکرین سے لے کر عہد حاضر کے فلسفیوں اور ادیان عالم میں بھی وجودی عناصر تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ آج سے کئی صدیاں قبل جب سقراط نے کہا اپنے آپ کو پہچانو(Known yourself) تو گویا وہ فرد کی ذات کی ہی بات کر رہا تھا۔ اس نے عملی طور پر وجودی ہونے کا ثبوت دیا اور بغاوت کی۔ جب ایتھنز کے لوگوں نے اس کے افکار پر پابندی لگانی چاہی اور اسے موت کی سزا سنائی۔ اس نے انکار کیا اور موت کو چنا۔ اس نے اپنے ذاتی شعور آزادی پر آنچ نہ آنے دی۔ آگسٹائن، پاسکل، مہاتما بدھ، ابن العربی اور ازمنہ وسطی کے دیگر فلسفوں کے ہاں بھی عرفان ذات سے متعلق خیالات ملتے ہیں۔ جن کی پاداش میں انہیں موت اور جلاوطنی جیسی سزائیں بھی ملتی رہیں۔ بعض مفکرین نے وجودیت کو جرمن

رومانویت میں بھی تلاش کیا۔ کیوں کہ رومانیت کا دائرہ کار بھی جذبہ پر تھا۔ جب کہ وجودیت بھی اسی طریقہ کار پر بنیاد رکھتی ہے۔

رومانیت بھی آزاد انفرادی زندگی فطری و معاشرتی حدود و قیود سے بغاوت ماضی پرستی فطرت سے محبت اور جذباتی المیے کا نام ہے یہ ایک مافوق فطرت اور تخیلاتی دنیا میں رہنے کا عمل ہے وجودیت کی طرح اس میں بھی حرکت عمل اور جذبے کا عنصر زیادہ ملتا ہے۔ ان ملتے جلتے عناصر کی بدولت کچھ مفکرین تو باقاعدہ وجودیت کو حد سے بڑھی ہوئی رومانویت کا نام دیتے ہیں۔ ان میں مشترک اقدار کی وجہ سے بظاہر یہ ایک سی کیفیت سے سرشار جذباتی رجحانات ہیں جن کا تعلق فرد کی داخلی وارتوں سے ہے چاہے وہ رجائی ہیں یا قنوطی۔ ہاں یہ کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے جیسی کیفیت ہے۔ عصری وجودیت جن افکار و خیالات سے عبارت ہے ان کا محور و مرکز کرکیگارڈ کی فکر پر مبنی ہے۔ لفظ وجودیت پہلی بار اسی نے استعمال کیا اور اسے جدید مفہوم عطا کیے۔ اس لیے وہ حقیقی معنوں میں پہلا وجودی مفکر کہلانے کا اہل ہے۔ ۱۹۴۶ تک اس کے خیالات کو اہمیت نہ دی گئی اور ان سے چشم پوشی کی گئی اس دوران اسے وجودی مفکر قرار دینے اور نہ قرار دینے پر بحث جاری رہی۔ لیکن ۱۹۴۶ میں پیرس میں ایک نشست ہوئی جس میں وجودیت کے حوالے سے مختصر مضمون پڑھا گیا اور اس کے بعد ہونے والی بحث میں کرکیگارڈ کو پہلا وجودی مفکر تسلیم کیا گیا۔ فلسفہ وجودیت ایک متنوع فلسفہ ہے اس کے حامی مفکرین کے ہاں بھی کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو خود کو وجودی ماننے سے بھی انکار کرتے ہیں، لیکن اثبات ذات، موضوعیت، آزادی اور زندگی کے داخلی وارداتوں کے حوالے سے بھی متفق نظر آتے ہیں۔ بعض نے اسے ایک انداز فکر گردانا اور بعض نے منفرد طرز حیات کچھ اسے فلسفہ ماننے سے انکاری ہیں اور اکثر نے اسے فکری تحریک کا نام دیا۔ پروفیسر احسان اشرف کے ہاں وجودیت کی ایک مثبت تعریف اور پہلو ملتا ہے وہ اپنی کتاب وجودیت کا فلسفہ میں لکھتے ہیں:

> "وجودیت محض نیستی نابودگی یا منفیت سے برسرپیکار ہونا نہیں ہے جو محض روایت پرستی کے خلاف بغاوت ہی نہیں بلکہ منفیت کے غار سے ایک مضبوط سورج بھی طلوع ہوتا ہے"۔ (۱۱)

وجودیت نے فرد کو اثبات ذات کے اساسی رویوں سے روشناس کرایا۔ اسے عزت و تکریم بخشی یہ انفرادیت اور آزادی کی بات کرتی ہے۔ یہ وجود سے قبل فرد کے کسی جوہر کو تسلیم نہیں کرتی حد سے بڑھی عقلیت کی تردید کرتی ہے۔ وجودیت کے نزدیک جذبی کیفیت اہم ہیں۔ جو کہ فرد کے ذاتی مشاہدے تجربے

اور عمل سے مربوط ہیں۔ وجودیت فرد کی ذات کی تصدیق کا فلسفہ ہے جو فکر کی بجائے جذبے پر مشتمل ہے۔ انسان نہ صرف دنیا بلکہ دیگر اشیاء و مخلوقات سے افضل ہے۔ یہی برتری اسے اثبات ذات کی ترغیب دیتی ہے۔ وہ زندگی کی مشکلات سے گھبرا کر کبھی بھی اپنے "ہونے" سے دستبردار نہیں ہوتا بلکہ اپنے مشاہدات و تجربات سے ممکنات کی دنیا کا سفر طے کرتا ہے۔ وجودیت وہ طرز فکر ہے جو وجود کو اہمیت دیتا ہے اور فرد کو اس کے خاص عمرانی مشاہدے اور تجربے سے جوڑے رکھتا ہے۔ ہمیں فلسفہ وجودیت میں درجہ ذیل اہم موضوعات ملتے ہیں۔

وجود، موضوعیت، داخلی وارداتیں، جہد و عمل، انتخاب، زمانیت، لغویت، عدمیت، نئی وجودیت

وجود

وجود کے لغوی معنی ہونا، موجود ہونا، ہستی اور زندگی کے ہیں۔ وجود کسی شے کے ہونے یا پائے جانے سے مشروط ہے لیکن یہاں وجود سے مراد ٹھوس نہیں۔ جیسے میز، کرسی، درخت وغیرہ بلکہ وجود سے مراد انسانی ہستی کے ہونے سے عبارت ہے۔

فرد اپنی ہستی اور وجود کو لے کر مسلسل جدوجہد کے عمل سے گزر رہا ہے اور اس کی اساس جذبے پر رکھی گئی ہے۔ اس طرح انسان ہی وہ واحد ہستی ہے جو جذبے سے سرفراز ہے فرد جن میں جذبوں کی ایک لامحدود وسعت پائی جاتی ہے۔ جو اس کے اندر اضطراب اور جستجو کی کیفیت کو جنم دیتی ہے تاکہ وہ حالات و واقعات سے نبرد آزما ہو سکے۔ یہی اضطرابی کیفیات اس کو نئے آفاق تلاش کرنے کی ہمت دیتے ہیں۔

وجود کی بنیاد عقل پر نہیں اور نہ ہی وجودی مفکرین حد سے بڑھی ہوئی عقلیت کے قائل ہیں۔ اسی بنا پر وہ ہیگل کے نظریات کی تردید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وجودیت کے نزدیک وجود عقل جوہر پر مقدم ہے وجود کے بنا ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہائیڈیگر کے ہاں وجود (Desein) کی تعمیر ہستی کے امکانات سے ہوئی ہے۔ وہاں خصوصیات کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اور اسی صورت وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکتا ہے۔ دوسری اہم بات وجود کا دنیا میں ہونا بھی لازمی ہے کیونکہ دنیا کی تفہیم وجود کی تفہیم کا سبب بنتی ہے۔

سارتر نے بھی وجود کو جوہر پر مقدم قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک ذات سے پہلے کسی شے کا وجود نہیں ہوتا۔ یعنی (To Exist) کی صورت ہے۔ یوں دنیا سے تقابل کر کے وجود اپنے ہونے کا عرفان پاتا ہے۔

کارل جیسپرز کے ہاں وجود مصدقہ ہستی کا محض ماخذ ہے۔ انسان پہلے وجود میں آتا ہے پھر دنیا کا سامنا کرتا ہے۔ ممکنات کا سفر طر کرتے ہوئے کائنات میں اُبھرتا ہے اور تصور کو تشکیل دیتے ہوئے اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔ وجود کی پہلی خصوصیت اس کا موجود ہونا لازمی ہے۔ دوسری اس کا یکتا اور منفرد ہونا ہے۔ وہ کسی سے مماثلت نہیں رکھتا۔ جبکہ تیسری اس کی ذات کی سچائی ہے جو موضوعیت سے پھوٹتی ہے۔

موضوعیت

موضوعیت اس کیفیت کا نام ہے جس میں ڈوب کر فرد جدوجہد سے ہم آہنگ ہو کر دنیا کا شعور حاصل کرتا ہے۔ وجود اور دنیا کے اسی تعلق کا برقرار رہنا بھی ضروری ہے۔ یہ فرد کی تکمیل کے لیے اہم ہے۔ دنیا کو تسخیر کرنے اور اس سے نبرد آزما ہونے کے بعد بھی انسان کو ایک یقین کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کہ موضوعیت کی بدولت ہی ممکن ہے۔ موضوعیت لفظ موصنوعی سے مشتق ہے۔ جس کے معنی نفسی خیالات اور داخلی کیفیات ہیں۔ انگریزی میں اس کے لئے لفظ (subjectivity) استعمال ہوتا ہے۔ موضوعیت کو ہستی کی سچائی اور صداقت سے تعبیر کیا جاتا ہے جو انسان کے کرب سے جنم لیتی ہے، جس کے تحت انسان اپنے اندر پیدا ہونے والے سوال کے جوابات ڈھونڈتا ہے۔ صداقت کی کوئی مکمل تعریف ممکن نہیں تمام مفکرین نے اپنے اپنے حساب سے اس کی تعریف کی۔ کرکیگارڈ کے ہاں فکر کا اساسی پہلو ہی موضوعیت ہے اس ضمن میں وہ کہتا ہے:

Only Subjective is there decisiveness .To seek objectivity is to be in error.

جبکہ ہائیڈیگر سچائی کو آزادی کے برابر قرار دیتا ہے۔ ہیگل نے شے کے نتائج کو سچائی قرار دیا جبکہ ویلیم اور مور نے حقیقت اور مظہر کے تعلق کو صداقت قرار دیا۔ جبکہ وجودی مفکرین کے ہاں داخلیت یا موضوعیت کو سچائی مانا جاتا ہے یعنی سچائی کا سرچشمہ انسان کی ذات ہے۔ وجود اور معروض کی کشمکش ہی فرد کو جدوجہد پر مائل کرتی ہے۔ فرد کے وجود کی طرح موضوعیت بھی مافوق الادارک ہے۔ دراصل موضوعیت انفرادی کا ہی پرتو ہے۔ انفرادیت سے مراد کسی فرد واحد کی زندگی اور اس کے وجود کی داخلی کیفیات پر اسے مکمل اختیار ہوتا ہے۔ یعنی تمام سماجی روایات و عقائد اور لگے بندھے رویوں سے بالاتر ہو کر اپنی مرضی سے جینا انفرادیت پرستی عمرانی علوم کی تاریخ جس شخصی آزادی کا دوسرا نام ہے جس کے مطابق فرد معاشرہ اور ریاست دونوں سے اہم ہے۔ زندگی کے تمام امور میں فرد کو آزادی ہونی چاہیے۔ وہ تمام رویے اور رجحانات جو فرد کی انفرادیت پرستی اور صداقت کے رستے میں حائل ہوں وجودیت انہیں رد کرتی ہے۔

داخلی وارداتیں

ایک فرد کی خارجی زندگی جو اس کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ہے اور دوسری وہ جو اس کی باطنی کیفیات کی آئینہ دار ہے۔ احساسات و جذبات انسانی وجود کے لازمی عناصر ہیں کیونکہ یہ فرد کے داخلی تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایک موضوعی اور دوسرے معروضی جذبے کا براہ راست تعلق انسانی وجود سے ہے۔ جب تک احساس نہ جاگے جذبہ بیدار نہیں ہو سکتا۔ منفرد کیفیات فرد کو دنیا سے جوڑے رکھتی ہیں۔ فرد کا دنیا میں موجود ہونا ہی اس کے احساسات و جذبی کیفیات کا نتیجہ ہے۔ یہی کیفیات فرد کو دنیاوی صورتحال سے دوچار کرانے کا باعث بنتی ہیں۔ یہ اس نوعیت کی کیفیات ہیں کہ ان کے جواز تلاش کرنا ناممکن ہے ڈاکٹر افتخار بیگ اپنی کتاب میں داخلی وارداتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "وجودی فلاسفر ان کیفیات کو نفسیاتی ماننے سے گریزاں ہیں۔ ان کے نزدیک یہ جذباتی کیفیات یا داخلی وارداتیں ہیں۔ کیونکہ نفسیاتی کیفیات کو تو عقلی پیمانے پر پرکھا جا سکتا ہے۔ جبکہ وجودی داخلی واردات کو عقلی معیار پر رکھنا ممکن نہیں ہے"۔ (۱۲)

داخلی واردات کو آگے مزید دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

قنوطی وارداتیں　　رجائی وارداتیں

قنوطیت سے مراد یاس ناامیدی کے ہیں۔ شعر و ادب میں اشیاء و واقعات کے تاریک پہلو تلاش کرنا۔ زندگی سے مایوس ہو کر مستقبل کی امید چھوڑ دینا قنوطیت کہلاتا ہے۔ قنوطی فلسفے کا سب سے بڑا مفکر شوپن ہاور جس نے زندگی کو شر اور شکست کو انسان کا مقدر کہا ہے۔ وجودیت کو کسی حد تک قنوطیت کا فلسفہ قرار دیا جاتا ہے جو کہ قنوطی وارداتوں کی وجہ سے کہا گیا۔ چند اہم قنوطی وارداتیں کرب، لایعنیت، اکتاہٹ، گھن کراہت، مایوسی، بے مقصدیت ہیں۔

داخلی وارداتوں کی دوسری قسم رجائی وارداتیں ہیں۔ رجائیت (Optimism) عربی لفظ رجا سے مشتق ہے جس کے معنی امید کے ہیں۔ شعر و ادب میں ایسے موضوعات ہیں جن میں خوشی، عزم، حوصلے اور امید کے جذبات پائے جاتے ہوں رجائیت کہلاتی ہے۔ کچھ وجودی مفکرین کے ہاں رجائی وارداتیں بھی پائی جاتی ہیں کیونکہ تمام تر داخلی وارداتوں کا تعلق جذبے سے جڑا ہے اس لیے جس طرح کے ممکنات سے انسان کا

واسطہ پڑتا ہے اس طرح کے احساسات و جذبات جنم لیتے ہیں اہم رجائی وارداتیں امید، خوشی، محبت اور عزم ہیں۔

وجودی فلاسفر ان کیفیات کو نفسیاتی یا تجریدی ماننے سے انکاری ہیں کیونکہ ان کا عقل سے کوئی لینا دینا نہیں۔ ان کے نزدیک یہ کیفیات جذبی اور تجرباتی ہیں۔ انہیں عقلی معیار پر پرکھنا ممکن نہیں۔

جہد و عمل

انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہے کہ فرد گزشتہ کئی صدیوں سے لگے بندھے نظاموں سے جھگڑتا رہا۔ یوں اس کی ذات اور وجود مسلسل نظر انداز ہوتا رہا۔ اس کے عقلی و معروضی حقائق سائنسی ترقی اور عقائد بھی اسے مطمئن نہ کر سکے تو وہ اپنے حقیقی وجود کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس دوران اس کی جذبی کیفیات اور داخلی وارداتیں اس کی معاون رہیں۔ سبھی مفکرین کے ہاں ایک ہی سوال تھا۔ میری ذات کیا ہے؟ اور اس کی اہمیت کیا ہے؟ اس کا جواب ہمیں پہلے کر کیارڈ کے ہاں ملتا ہے کہ وجود تمام اشیاء کا نچوڑ ہے۔ جو کہ آزادی سے مشروط ہے۔ لیکن اس سفر پر جانے کے لیے جدوجہد عمل لازمی جزو ہے جس کا اہم ستون موضوعیت ہے۔ یعنی جدوجہد بنا موضوعیت کے کچھ نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان تصور حریت کی مضبوط کڑی موجود ہے۔ یہ کھرا پن ہی ہستی کی تصدیق ہے دنیا اور وجود کے آپسی مضبوط تعلق کو مارسل نے جدوجہد سے مربوط کیا ہے۔ مارسل کے ہاں بھی یہ آزادی سے تعبیر ہے۔ سارتر کا کہنا ہے کہ انسان اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خود کو جو بناتا ہے۔ اس ہونے اور بننے کے عمل کو جہد و عمل کا دور قرار دیا جاتا ہے۔ وجود کبھی بھی اپنی جدوجہد کے سفر میں اپنی ذمہ داری اور آزادی کے حوالے سے عقلیت کے آسرے پر نہیں رہا۔ وہ اپنی قوت ارادی پر بھروسہ کرتے ہوئے ممکنات کا سامنا کرتا ہے اور آزادی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ فرد کی ذات اہم ہے۔ تو اس کی پہچان اور عرفان کے لیے انقلابی کیفیات کا ہونا لازم ہے۔ جس کے لیے وہ روایتی نظاموں کے چنگل سے نکل کر اپنی روایات اور اقدار کو تخلیق کرتا ہے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر فیصلے کرتا ہے یہی تصور حریت اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

انتخاب (امکان، فیصلہ)

ممکنہ صورتحال میں فرد کا بہترین فیصلہ ہی اسے عرفان ذات کے حصول میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ فرد کو ہر وقت نئے نئے امکانات اور کیفیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ کوئی مقدر کا لکھا نہیں بلکہ ایک ممکنہ

صورتحال کا نام ہے جو شخص کرب اور دہشت کی کیفیات سے دوچار رہا ہو۔ گویا اس نے امکانات کی دنیا میں تربیت پائی جو کہ ایک لامحدود کیفیت کا نام ہے یہ اچھائی اور برائی پر مشتمل نہیں بلکہ انسانی وجود کے انتخاب سے جڑی کیفیت کا نام ہے۔ فرد کا ذاتی انتخاب ہی اسے اچھائی اور برائی میں بدل دیتا ہے۔ یہ آسان صورتحال نہیں بلکہ ایک کڑا امتحان ہے جو عرفان ذات کی ترغیب دیتا ہے۔ فرد کرب اور خوشی جیسی وارداتوں سے روشناس کراتا ہے۔ انتخاب طے شدہ صورتحال کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ ہر لمحہ وقت نئے امکانات کے سفر پر رہتا ہے یہ ایک موضوعی کیفیت ہے جس پر یقین رکھتے ہوئے فرد خدا کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اپنی اخلاقیات کا تعین کرتا ہے جو کہ اس میں جذبہ آزادی کا شعور پیدا کرتا ہے۔ انتخاب فرد کی مجبوری ہے کیونکہ اس کے بنا امکانات کی دنیا میں سفر کرنا ناممکن ہے یہ پل پل بدلتی صورتحال کا نام ہے۔

کرکیگارڈ نے فرد کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جو کہ جمالیاتی، اخلاقی اور مذہبیاتی ادوار پر مشتمل ہیں پہلو دور بے خبری کا دور ہے جہاں فرد اپنی ذات سے بھی آشنا نہیں ہوتا اور اپنے انتخاب کو ضائع کر دیتا ہے۔ اخلاقی دور میں وہ اپنی ذات اور وجود سے شناسائی حاصل کرتا ہے اور یہی کیفیت اسے تیسرے دور میں لے جاتی ہے جو کہ کڑی ریاضت کا دور ہے۔ امکان سے انتخاب اور انتخاب سے فیصلے تک کے سفر میں فرد کئی ایک داخلی وارداتوں سے نبرد آزما رہتا ہے۔ کچھ مفکرین کے نزدیک انتخاب اور شعور ایک ہی شے ہیں کیونکہ یہ فرد کی لایعنی رویے کی پیداوار ہے۔

زمانیت

انسان وقت کا غلام ہے زندگی گزارتا ہے اور مر جاتا ہے۔ زندگی کی یہ فناپذیری فرد کے لیے مسلسل خوف او کرب کا باعث ہے۔ وجود پیدائش اور موت کے درمیان الجھا ہوا ہے۔ ان دو حدوں کے درمیان فاصلے کا تعین وقت کرتا ہے۔ یہی مدتیں اور گردش وقت زمانے پیدا کرتی ہیں۔ فرد، وجود اور وقت کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ وجود کی بنیادی خصوصیت تشویش ہے جو کہ امکان، حقیقت یا واقفیت اور ہبوطیت پر مشتمل ہے۔ امکان کا تعلق مستقبل سے ہے۔ جو کہ فرد کے انتخاب اور فیصلے پر منحصر ہے۔ فرد اپنے مستقبل کے لیے لمحہ وقت امکانات سے نبرد آزما رہتا ہے۔ موت انسانی وجود کا سب سے بڑا امکان ہے جس کے سامنے چھوٹے بڑے سبھی مکانات بے بس نظر آتے ہیں دوسرا اہم نکتہ حقیقت یا واقفیت کا ہے یعنی انسانی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات معروضی نہیں بلکہ موضوعی ہیں۔ حقیقت کا تعلق ہماری طے شدہ صورتحال سے ہے ہمارے اپنے ذاتی تجربے اور عمل پر بنیاد کرتا ہے۔ جبکہ تیسرا نکتہ ہبوطیت کا ہے۔

یعنی انسان اس دنیا میں پھینکا گیا ہے۔ دنیا ایک ہجوم ہے جس میں فرد کو اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لیے مسلسل تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ یہ ساری کیفیات وقت کے ساتھ منسلک ہیں۔ حقیقت یا واقفیت کا تعلق حال اور ماضی سے ہے۔ ہبو طیت لمحہ موجود میں گم ہونے اور امکان کا تعلق مستقبل سے ہے۔ یہ تینوں زمانے ماضی، حال اور مستقبل ایک دوسرے کے تعاقب میں ہیں۔ مستقبل کا ہر لمحہ حال میں اور حال ماضی میں ڈھلتا جارہا ہے۔ فرد کے لیے تشویش کی بات ہے کہ نہ ہی وقت میں ٹھہراؤ ہے نہ ہی وہ محدود کیفیت ہے اور موت سامنے ایک قوی امکان کی صورت کھڑی ہے۔ ماضی حال اور مستقبل ایک سیدھے خط کی مانند چلتے ہیں جن پر فرد اپنے عمل و تجربے کی روشنی میں چلتا دیکھائی دیتا ہے۔

لغویت

وجود اپنی مخصوص زندگی میں کئی حادثات و سانحات سے گزرتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ یا خطرہ جو وجود کو پیش ہے۔ وہ اس کی المیاتی کیفیت ہے۔ اس ہر وقت اپنی محدودیت کا احساس رہتا ہے۔ وہ امکانات سے نبرد آزما رہتا ہے پل پل بدلتے حالات و واقعات سے لڑتا ہے یہ ایک جہد مسلسل کا نام ہے۔ اس مسلسل کوشش کے بعد فرد کو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ دنیا لغو ہے۔ سارتر نے اس نے اس بے معنی زندگی کو لایعنی قرار دیا۔ جبکہ کامیو نے اسے لغو قرار دیا۔ کامیو کے نزدیک زندگی مسلسل جدوجہد ہے اور فرد واقفیت اور محدودیت کا ازلی غلام ہے جس کی وجہ سے مسلسل کرب کا شکار رہتا ہے۔ ہفتے کے دنوں میں ایک جیسی مصروفیت ایک ہی انداز سے زندگی بسر کرنا یکسانیت اور بوریت سے بھرپور زندگی اس کے لغو ہونے کی علامت ہے۔ یہاں لغو کے معنی بے کار، بے معنی اور لایعنی کے ہیں۔ زندگی گرفت میں آنے والی شے نہیں ہے۔ فرد ساری زندگی اپنے وجود کی تلاش اس کی پہچان اور اسے اعتماد دینے میں صرف کر دیتا ہے۔ لیکن زندگی کی بے معنویت اس پر حاوی ہو جاتی ہے۔ دل اور دنیا کے الگ الگ تقاضے ہیں اور ان کی الگ الگ سچائیاں جن پر بیک وقت کھرا اترنا مشکل کام ہے۔ فرد کی ہمہ وقت امکانات سے جنگ اور جدوجہد لا حاصل ہوتی ہے۔ فرد کو اس جدوجہد کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں یہ فرد کی زندگی کی معراج ہے کہ وہ تمام عمر اسی کرب لایعنیت کے باوجود اپنی کوشش کو جاری رکھے۔ کیوں کہ زندگی لغو اور مہمل ہو سکتی ہے لیکن بے معنی نہیں۔ یہی اثبات ذات کا تقاضہ ہے اور فرد کی دائمی مسرت و اطمینان کی وجہ ہے۔ اگر ایک فرد کی حیثیت سے کامیو کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہے کہ کامیو کی زندگی میں اسے ایسے حالات میسر آئے جہاں کرب، لایعنیت کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ زندگی بھر لغویت کے فلسفے کا پرچار کرتا رہا۔ پھر اس حادثاتی موت نے

زندگی کے بے معنی ہونے پر آخری مہر ثبت کر دی۔ کامیو نے دیگر فلسفیوں کی طرح دقیق اصطلاح اور پیچیدہ افکار پیش نہیں کیے لیکن وجودی روایات کا نمائندہ فلسفی ہے اس کے مضامین ارسطو سسی فس اور باغ ہیں۔ جن پر اس کے دو مشہور ناول اجنبی اور پلنگ ہیں یہی اس کے ذہنی ارتقاء کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگرچہ اجنبی کا ہیرو سسی فس لغویت کا شکار ہے اور ایک لایعنی زندگی جی رہا ہے تو سزا پاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف باغی میں کامیو کی سوچ اور افکار بدل جاتے ہیں باغی کا کردار ہر جنم کے لگے بندھے رویوں سے بغاوت کرتا ہے اور آخری سانس تک جدوجہد کرتا ہے۔

عدمیت

عدمیت (Nihilism) ایک ایسا فلسفہ جو انسانی وجود کے عام قبول شدہ بنیادی پہلوؤں (معروضی سچائی، اخلاقیات، اقدار) کو مسترد کرتا ہے۔ اس انقلابی صورتحال جو اپنی ذات کے لیے معاشرتی نظام کو ختم کر کے از سر نو تعمیر کی بات کرے۔ جہاں کر کیارڈ کے ہاں سچائی کو موضوعی قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح نطشے کی عدمیت کو جدیدیت کا عارضہ قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی جدید یورپ اور موجودہ معاشرتی نظام کی تعمیر اسلامی عقیدے کی رو سے ہے جو کہ مادی اور حسی دنیا کے قوانین میں ایک ایسی دنیا اخذ کرتا ہے جو ماروا ہے۔ دونوں دنیاؤں کی الگ الگ سچائیاں ہیں بقول نطشے مادی دنیا کی اقدار اس کی اپنی سچائی سے طے پاتی ہیں۔ نطشے پرانے تمام نظاموں کو مہندم کر کے ایک نئے نظام کی بات کرتا ہے۔ پرانے انہدام کے بعد جدید رویے نئی تعمیر کے لیے سامان اور فکر مہیا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یاسر جواد لکھتے ہیں:

> "اعلیٰ ترین اقدار کی ناقدری کو بیان کرنے کے لیے نطشے نے "Nihilism"(فنائیت، عدمیت، انکار کل ،لاشئیت) کی اصطلاح استعمال کی۔ اس نے اپنے دور کو مجہول انکار کل سے متصف خیال کیا، یعنی ایک ایسا دور جو ابھی تک آگاہ نہیں تھا کہ مذہبی اور فلسفیانہ مطلق مفروضات انیسویں صدی کی ابھرتی ہوئی ثبوتیت میں تحلیل ہو گئے تھے۔"(۱۳)

روایتی اخلاقیات کے انہدام پر بے مقصدیت اور بے معنویت کا احساس باقی رہ گیا ہے۔ جو کہ عدمیت کی طرف رجحان ہے۔ نطشے کے فلسفے کے دو پہلو ہیں۔ پہلے حصے میں وہ روایتی اور فطری نظاموں کی نفی کرتا ہوا عدمیت تک جا پہنچتا ہے۔ اور دوسرے میں اس نے عدمیت سے نتائج اخذ کئے جو کہ فوق البشر کے نظریے کی

بنیاد بنا اس کے فلسفے کا پہلا حصہ وجودیت سے متعلق ہے۔ جس میں اس نے المیاتی کشمکش، لگے بندھے رویوں سے انکار اور زندگی کی بے ترتیبی اور لایعنی کیفیات کی بات کرتا ہے۔ وہ ایک نیا جہاں آباد کرنے کی بات کرتا ہے۔ جہاں المیہ اور طربیہ کو مکمل طور پر قبول کیا جائے۔ وہ فرد کی آزادی اور انفرادی ذمہ داری کی بات کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تمام تجریدی منطقی اور عقلی فلسفے کو مسترد کرتا ہے۔ کرکیگارڈ کو خدا کے دامن میں پناہ مل گئی جبکہ نطشے خدا کے مرگ کا اعلان کرتے ہوئے عدمیت کے بھنور میں پھنس گیا۔ خدا کی موت کا اعلان کر کے اس نے اپنے افکار کو بے راہ کر لیا کیونکہ خدا سے محرومی اور اخلاقیات کی موت کوئی خوشی کی بات نہیں۔ آزاد انسانی زندگی جو ہر طرح کے فکری اور روایتی نظاموں سے آزاد ہو۔ تکمیل ذات کے لیے کوئی بھی راہ چن سکتا ہے۔ نطشے توقع کرتا ہے کہ انسان ان حالات سے مستفید ہوتے ہوئے تاریخ کا جزو بن سکتا ہے لیکن عدمیت ہر حال میں فرد پر حاوی ہے جو کہ ایک افسوس ناک سچائی ہے اور اس دنیا سے نجات کا ذریعہ بھی۔

نئی وجودیت

۱۹۵۶ کو اپنی پہلی کتاب ''آوٹ سائیڈ'' سے شہرت پانے والے نوجوان فلسفی کولن ولسن نے اپنے فلسفے کو نئی وجودیت کا نام دیا۔ اس نے یہ نام کرکیگارڈ اور سارتر کی روایتی وجودیت میں تمیز کرنے کے لئے دیا۔ دراصل نئی وجودیت رجائیت کا پیغام ہے قنوطیت کی بدولت وجودیت جیسے وسیع موضوع کو ایک مرحلے پر آکر رکنا پڑا اس کا اگلا سفر اس کی قنوطیت اور عدمیت کی بدولت ناگزیر ہوا۔ بقول کولن ولسن کے پرانی وجودیت نے انسان کو گمراہ کر دیا۔ اور اسے مسلسل کرب، لایعنیت اور دکھ کے دلدل میں دھکیل دیا اور اقلیت کے خلاف منفی احتجاج کے طور پر سامنے آئی یہی منفی رجحانات وجودیت کی ترقی میں رکاوٹ بنے۔ ۱۹۶۰ میں کامیو کی نگہانی موت اور سارتر کے جدلیاتی شاہکار نے اسے قنوطیت سے نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے ولسن نے وجودیت میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی وہ اسے روحانیت کے برابر قرار دیتا ہے یا یہ روحانیت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دیگر وجودی مفکرین کی طرح ولسن کے ہاں بھی فرد آزاد ہے اور دنیا ایک لایعنی مقام ہے۔ فرد کا وجود لامحدود صلاحیتوں کا مالک ہے اور اس کے تحت الشعور میں تمام عالم موجود ہے ولسن کے نزدیک پرانی وجودیت دیواروں کے اندرونی دنیا میں گھٹ کر جینے کا نام ہے۔ جبکہ آگے بڑھنا خود کو سنوارنے منوانے اور شعور کے امکانات سے نبرد آزما ہونے کی سعی کرتے رہنے کا نام ہے۔ محض فطری تقاضوں کے حصول اور خواہشات کی غلامی میں زندگی بسر کرنا اور ہار مان لینا سراسر ناکامی ہے۔ آزادی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انسان ایک بے مقصد زندگی بسر کرے۔ جس شخص کی زندگی مقصدیت سے خالی ہو مسلسل

ناکامی کی راہ پر گامزن رہتا ہے زندگی میں کسی ٹھوس نصب العین کا ہونا لازمی ہے۔ وجودیت نے اگر پھلنا پھولنا ہے تو اسے زبان کی مظہریت عصری فلسفے، لسانی روایات سے ہم آہنگ ہو کر چلنا پڑے گا۔ فلسفہ وجودیت حالانکہ تاریخی و فلسفیاتی اہمیت کا حامل ہے لیکن عصر حاضر کی اہم کتابوں میں اس کا تذکرہ یا تو ملتا ہی نہیں یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس غیر پسندیدہ صورتحال کے باوجود ولسن نے نئی وجودیت کی بات کر کے امید کی بات کی ہے۔ وہ تخلیقی اور لسانی روایات کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے کی فکر رکھتا ہے۔ نہ کہ ایک متوازن وہمہ گیر فلسفے کی راہ ہموار ہو سکے۔

ج۔ وجودیت کے تناظرات

i۔ وجودیت کے مغربی تناظرات

وجودیت کا آغاز انسانی زندگی کے ارتقاء سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ انسان کی پیدائش سے ہی ذات کی شناخت کے مسائل نے جنم لیا۔ پھر جہاں جہاں اضطراب کی کیفیت نے جنم لیا۔ وجودی مسائل اور عناصر وہاں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ ہر زمانے میں صاحب فہم لوگوں نے وجودی مسائل کو زیر بحث لایا۔ گویا کہ ان کے نظریات اور رجحانات میں فرق رہا ہو گا۔ لیکن وہ فرد کی انفرادیت اور آزادی کے متعلق یکساں سوچ رکھتے تھے۔ عہد قدیم ہوں یا ازمنہ وسطی تمام عہد کے مفکرین نے کہیں نہ کہیں وجود کے حوالے سے بات کی۔ وجودیت کا باقاعدہ نقطہ آغاز اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل میں ملتا ہے۔ یوں تو جب ارسطو خود کو پہچاننے کی بات کرتا ہے یا سقراط اپنے نظریات پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے سزا پاتا ہے تو گویا وہ اپنے وجود کی شناخت کے لیے لڑ رہے تھے۔ اس طرح ازمنہ وسطی کے تمام مفکرین نے بھی وجودی مسائل کے حق میں آواز اٹھائی اور سزا کے طور پر جلاوطن ہوئے یا موت کا سامنا کرنا پڑا۔ روئے زمین پر تنازعات اور انتشار کی کیفیت ہمیشہ کسی نہ کسی صورت برقرار رہی۔ جس کے نتیجے میں کئی خون ریز جنگیں ہوئیں۔ کئی سیاسی اور سماجی انقلاب بعد وقوع پذیر ہوئے۔ کبھی حکمرانوں کی اجارہ داری ہوئی اور کبھی نام نہاد مذہبی رہنماؤں نے فرد کی داخلی زندگی پر دباؤ ڈالا اور اسے حقیر و کمتر قرار دیا۔ عام آدمی کو تعلیم سے دور کر کے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ختم کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں معاشرے مزید اضطرابی کیفیت کا شکار ہوئے۔ بوریت اور لایعنی کیفیات نے فرد کو اپنے حق کے لئے لڑنے اور سوچنے پر آمادہ کیا یہی دور وجودیت کا نقطہ آغاز کہلاتا ہے۔ بیسویں صدی میں انقلاب فرانس جنگ عظیم اول و دوم علمی و سائنسی ترقی کے نتائج، مذہب سے دوری،

اخلاقیات کے خاتمے اور جدیدیت کے پرچار نے فرد کو تنہائی اور لایعنیت کی طرف دھکیل دیا۔ فرد کا اپنی ذات سے دور ہوتا چلا گیا زندگی اور فرد کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے تو ادب کی دنیا میں نئے موضوعات اور رویوں نے جنم لیا انقلاب فرانس جو باقاعدہ ایک نظریاتی دور کا آغاز تھا۔ مانسیکو، والٹیر، دایدارو اور روسو کے نظریات نے فرانسیسی ادب میں بدلاؤ لایا۔ ان کی انقلابی تحریر نے عوام کو اپنے مسائل پر سوچنے کے لئے مجبور کیا۔ فلسفے کی دنیا میں کئی نئے رجحانات اور تحریکوں نے جنم لیا۔ جن میں ہیگلیت، نوہیگلیت، عملیت پسندی، حقیقت پسندی، اشتراکیت، تجریدیت، رومانویت اور وجودیت قابل ذکر ہیں۔ ان تمام عصری فلسفوں نے جہاں انسانی فکر کو وسعت بخشی وہیں انسان اپنے داخلی سوالات کے جواب پانے کے لیے بے چین رہا۔ عملیت اور اشتراکیت جیسے فلسفوں نے جہاں انسان کو معاشی استحکام کی راہ دکھائی وہیں جدیدیت اور سائنس کے بڑھتے ہوئے رجحان نے ابتری، مایوسی، مادہ پرستی، سیاسی، سماجی اور مذہبی انتشار کو جنم دیا۔ شکست وریخت کے اس عمل نے فلسفہ وجودیت کو خام مواد مہیا کیا۔ بیسویں صدی میں علمی وسائنسی ترقی نے فرد کو وجودی کرب میں مبتلا کر دیا۔ زندگی اور فرد کی ہستی کے درمیان ایک نہ پر ہونے والا خلا پیدا ہوتا چلا گیا۔ اس کے داخلی رویے اس مادی ترقی سے سکون نہ پا سکے تو فرد نے مذہب اور اخلاقیات سے بھی بغاوت شروع کر دی۔ بیسویں صدی میں یورپی مفکرین کے افکار وخیالات کو دنیا بھر میں کافی پذیرائی ملی یوں مغربی دنیا میں فلسفہ وجودیت کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔

وجودی مفکرین جو خدا کے ماننے والوں میں سے ہیں۔ ان میں وجودیت کا بانی سوزن کرکیگارڈ، کارل بارتھ، پال ٹلچ، ردؤلف بلٹماں، نکولائی بردوف، جرئیل مارسل، اور کارل جیسپر شامل ہیں۔

جو وجودی مفکرین خدا کے وجود سے انکاری ہیں اور ملحدانہ روش اختیار کرنے پر بے تحاشا تنقید کا نشانہ بھی بنے ان میں فریڈرک، نطشے، مارٹن ہائیڈیگر، ژاں پال سارتر، البرٹ کامیو شامل ہیں۔

ذیل میں ہم ان مفکرین کے افکار پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

سوزن کرکیگارڈ

سوزن کرکیگارڈ کو وجودیت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ سوزن کرکیگارڈ کوپن ہیگن میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن مفلسی اور ذہنی کشمکش میں گزرا ظاہری خوبصورتی اپنی جگہ لیکن وہ بلا کا ذہین تھا۔ مایوسی بچپن سے نکل کر جونہی سوزن کرکیگارڈ نے جوانی میں قدم رکھا وہ ڈچ دوشیزہ ریچنا سے محبت کر بیٹھا۔ کتنے ہی سال جرات اظہار نہ ہوئی۔ مشکل سے منگنی کی۔ لیکن جلد ہی یہ احساس ہوا کہ یہ ایک جذباتی فیصلہ ہے یوں وہ ایک رشتے سے بھی

آزاد ہوا۔ سوزن کرکیگارڈ کی نئی زندگی کا آغاز کی ادبی زندگی سے ہوا ۱۸۴۵ میں اس نے جعلی نام سے لکھنا شروع کیا۔ مروجہ عیسائیت پر لکھنے کی وجہ سے اہل کلیسا نے اسے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے خلاف مضامین چھپنے لگے وہ ان سب کے برابر جواب دیتا رہا۔ اس ذہنی خانہ جنگی کا یہ نتیجہ ہوا کہ سوزن کرکیگارڈ ۳۵ سال کی عمر میں بوڑھا نظر آنے لگا۔ اس کی صحت بحال نہ ہو سکی اور وہ جلد ہی جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ اگر کرکیگارڈ کے افکار کی بات کی جائے تو اس فلسفی کے ہاں موضوعی سچائی اور وجود کی انفرادیت اور آزادی کی بات کی گئی ہے۔ اس کے ہاں یہ موضوعی ہیں جن کا فکر اور جوہر سے کوئی تعلق نہیں۔ کرکیگارڈ تمام عقلی اور مشینی فلسفوں اور تصورات کے خلاف ہے اس کے نزدیک ان تصورات نے مذہب اور اخلاقیات کو نقصان پہنچایا اور معروضیت جھوٹ ہے۔ وہ زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ جمالیاتی، اخلاقی اور مذہبی۔ پہلا دور لاُبالی دور ہوتا ہے۔ جس سے سبق سیکھتے ہوئے انسان اخلاقی دور میں داخل ہوتا ہے۔ جو کہ سکون کا مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ بھی محدود مرحلہ ہے۔ آخر دور مذہبی ہے جو کہ خدا اور انسان کے درمیان تعلق ہے۔ یہ مرحلہ احساس گناہ کے نتیجے میں پروان چڑھتا ہے۔ یہ مصائب کا دور ہے۔ جس میں روحانی، بلندی کا دور ہے۔ جس میں دکھ، درد اور لایعنی کیفیات انسان کو خدا کے نزدیک لاتی ہیں۔ خدا تجرید اور استدلال کے ذریعے نہیں پا سکتا بلکہ یہ فرد کا داخلی مسئلہ ہے۔ جو نامعلوم ممکنات کا سفر ہے یہ ایک جدلیاتی عمل ہے۔ جس کا عقل سے کچھ لینا دینا نہیں اور ان ادوار میں موجود فاصلے کو عقل یا فکر کے ذریعے نہیں طے کیا جاسکتا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ کرکیگارڈ کے افکار نظریہ ہیگل کا رد عمل تھے۔ کرکیگارڈ عقل کی مطلق نفی نہیں کرتا مگر وہ حد سے بڑھی ہوئی عقلیت کو رد کرتا ہے۔ وہ کسی صورت بھی اپنی ذات کو کسی لگے بندھے نظام میں گم کرنے کا قائل نہیں نہ ہی وہ اپنی انفرادیت پر حرف آنے دیتا ہے۔ اصل سچائی فردیت اور موضوعیت ہے وہ عقل و فکر اور سائنسی پیمانوں کی بجائے داخلی احساس کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے ہاں تنہائی خواب دہشت تشویش، انتخاب اور آزادی کی وجودی صورتحال جابجا دیکھی جاسکتی ہیں۔ وہ معروض کی نفی اور موضوع کے اثبات کی بات کرتا ہے۔ اس کے فلسفے کی سب سے اہم بات اس کا "کارنامہ مکاتیب" ہے۔ یعنی جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا۔

کارل بارتھ (۱۹۶۸-۱۹۱۳)

وجودیت اس دور کی پیداوار ہے جب دنیا میں مذہب اور اخلاقیات پر کئی سوالات اٹھائے گئے۔ ایسے میں کئی دنیائی نظام کسی نہ کسی طرح وجودیت کے مرہون منت ہیں۔ دنیات کے حوالے سے جو ابتدائی وجودی تصورات ہمیں کرکیگارڈ کے ہاں ملتے ہیں وہی آگے چل کر کارل بارتھ، پال ٹلچ، ریڈولف، بلٹمان، بردوف

کولائی، کارل جیسپر اور جیبر ائیل مارسل کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ کارل بارتھ قدامت پرست نظریات کو ماننے اور ان میں اپنے دلائل سے نئی روح پھونکنے کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ کارل بارتھ ایک مذہبی وجودی فلسفی ہے اس نے آزاد خیالدنیات کو رد کیا تو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے عیسائیت کو عقلی بنیادیں فراہم کیں۔ اس میں موجود مسائل پر بحث کرتے ہوئے ایک ایسا نظام ترتیب دیا جس میں موجود (Being) اور غیر موجود (Not Being) کی اصطلاحات متعارف کرائیں کارل بارتھ نے روایتی مکتب پرستی کو رد کرتے ہوئے خدا کے معنی، اس کے وجود، اثبات ذات اور اخلاقیات کو نئے اور غیر روایتی انداز سے نئے معانی عطا کیے۔

پال ٹلچ (۱۹۰۵-۱۹۰۸)

کارل بارتھ کے بعد پال ٹلچ نے وجودی مواد کو از سر نو منظم کرنے کی کوشش کی اس کے افکار ہیڈیگر سے مماثلت رکھتے تھے۔ مگر وہ الہیاتی وجودیت کا قائل فلسفی تھا۔ اس نے بھی وجود اور غیر وجود جیسی اصطلاحات کو اپنے فلسفے میں اہم مقام دیا۔ وہ خدا کے وجود کو (Being it self) کے معنی دیتا ہے۔ اس کے نزدیگ جنگ عظیم دوم کے بعد کا زمانہ یورپ اور امریکہ میں فکری تشویش اور کرب کا دور کہلاتا ہے۔ جس نے وجود کو خوف، فنائیت اور موت کے احساس سے روشناس کرایا۔ جس سے فرار ممکن نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا اندھا کنواں تھا جس میں روشنی اور امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ ایسے میں ہمیں پال ٹلچ کے ہاں خالی پن اور بے معنویت تشویش گناہ و سزا جیسی وجودی صورتحال نظر آتی ہے۔ اس کے خیال میں زندگی سے فرار ممکن نہیں ہے۔ مذہب سے دوری مزید مسائل کو جنم دے سکتی ہے لیکن فی زمانہ انسان جدید زندگی اور سائنس میں روحانی سکون کی تلاش میں ہے جو ممکن نہیں۔

رڈولف بلٹمان (۱۹۷۳-۱۹۱۷)

رڈولف بلٹمان نے بھی عیسایت کی تشکیل نو چاہی۔ اس نے مذہب سے جڑے وجود کو معتبر وجود قرار دیا۔ ایسا وجود اپنی آزادی کا خیال کرتے ہوئے زندگی میں ممکنات اور حدود کا مقابلہ اپنی موت تک کرتا ہے۔ جب کہ نامعتبر وجود کرب، دہشت اور زندگی کی لایعنیت سے ہار جاتے ہیں۔ فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور موت سے پہلے کئی بار مرتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔

نکولائی بردوف

روسی مفکر نکولائی بردوف بھی مذہبی وجودی مفکرین میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کا فلسفہ وجود اور آزادی کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن دوسرے وجودی مفکرین سے مختلف ہے اس نے فلسفہ آزادی، تصور، خلقت اور روحانیت پر مبنی نظریات پر مختلف الجہت افکار دیے اس کے فلسفے کی ساری جہتیں فرد کے گرد گھومتی ہیں۔ نکولائی نے عیسائیت کے مرکزی اصولوں سے مدد لی۔ وجود اور ہستی کے روحانی تصورات پر بات کی وہ جبریت فطرت اور جبریت سماج کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ بردوف کے نزدیک تخلیقی اخلاق اور جہد مسلسل انسان کو شعور عطا کرتے ہیں۔ جس کے تحت فرد کئی دنیا تعمیر کرتا ہے اور زندگی کو نئے معانی عطا کرتا ہے۔

جبرئیل مارسل

فرانسیسی ادیب جبرئیل مارسل الہیاتی وجودیت کا قائل تھا۔ مگر دیگر وجودیوں کی طرح وہ بھی خود کو وجود ماننے سے انکاری رہا مذہب کی طرف رجحان مارسل کو خاندان کی طرف سے وارثت میں ملا۔ پہلے وہ جرمن کلاسیکل فلسفے سے متاثر تھا لیکن جنگ عظیم اول کے بعد وہ تجریدی فلسفہ سے متاثر ہو گیا۔ وہ ذہنی انقلاب کے دشوار تجربے سے گزرا۔ مارسل کے نزدیک سائنس معروضات کا مطالعہ کرتی ہے لیکن وجودی تجربے تک رسائی نہیں رکھتی صداقت کی جستجو کے لیے ضروری ہے کہ فرد اپنی ذات کو اہمیت دے وہ فرد کی معروضیت اور بے جا سائنسی رجحانات کی مذمت کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی اس کائنات میں شمولیت اس کے جسم کی وجہ ہے جو کہ ایک بھید ہیں ایسا بھید جو کہ تجربے میں موجود ہو لیکن اس کی کھوج نہ کی جا سکے۔ یہ جستجو فرد کو خدا کے قریب لے جاتی ہے۔ اور یوں فرد عرفان ذات اور عرفان الٰہی کا کمال حاصل کر لیتا ہے

کارل جیسپرز (۱۹۶۹-۱۹۱۰)

الہیاتی وجودی مفکرین میں کارل جیسپرز سب سے منظم اور باقاعدہ فلاسفر ہے، جس نے مابعد الطبیعیات سائنسی اور وجودی فلسفہ کے ساتھ مکمل انصاف کیا۔ کارل جیسپرز نے کرکیگارڈ کے بکھرے ہوئے فلسفے کو منظّم ترین شکل میں پیش کیا۔ جیسپرز کی ذہنی سطح بہت وسیع تھی۔ اس نے مابعد الطبیعات اور سائنسی دنیا کی اب تک کی سچائیوں کو قبول کرتے ہوئے وجودی فلسفہ کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے فرد، سائنس اور کائنات کے درمیان مضبوط تعلق کی وضاحت کی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی تنقید کی کہ موجودہ مفکرین سائنسی علوم کے پیش نظر شخصیت فرد کا مطالعہ محض ایک (Object) کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ اس طرح آج کے انسان نے اپنی روح اور سکون کھو دیا۔ کارل جیسپرز اس منفی رویے

کی مذمت کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے اندر ایک سوچنے والی ذات ہے جس کے ذریعے کائنات کا مطالعہ ممکن ہے۔ سائنس اور کائنات کے درمیان ایک عمیق رشتہ ہے۔

جدیدیت نے اس پر واضح اثرات مرتب کیے ہیں۔ فرد کی حیثیت ایک مشین جیسی ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اس میں ایک بیزاری اور لایعنیت کی کیفیت پیدا ہو چکی ہے۔ کارل جیسپرز کرکیگارڈ کے افکار کو نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ انہیں ایک منظم شکل بھی دیتا ہے لیکن وہ اس کے منفی طرز فکر کی مذمت بھی کرتا ہے۔ وہ انتہا پسندی کا قائل نہیں وہ عالمی اخوت، آزاد خیالی اور آزادی پسند افکار کا حامل ہے۔ وہ موضوعی سچائی کے آفاقی ہونے کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ الہیاتی وجودیت کے مفکر سوزن کرکیگارڈ سے لے کر کارل جیسپرز تک تمام فلسفیوں کے افکار کے مطالعے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ فردیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ معروض اور اس کے فہم کے لیے استعمال ہونے والے سائنسی پیمانوں اور حد سے بڑھی ہوئی عقلیت کی تردید کرتے ہیں۔ ان کے لئے اصل سچائی فرد کی ذات اور موضوعیت ہے۔ وہ پہلے سے موجود ماہیت یا جوہر کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں بلکہ انسان کے ذاتی کردار کو اہمیت دیتے ہیں خارجیت کی بجائے داخلی کیفیات پر زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وجودیت کا مرکزی کردار اگر انسان ہے تو ساتھ ہی مذہبی فکر کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ فرد کی شناخت اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کا تعلق خدا سے مضبوط ہو۔ یعنی ایمان فرد کی بنیادی ضرورت ہے۔ اپنی ذات کا کھوج اور حق و صداقت تک پہنچنے کے لئے خدا اور اخلاقی اقدار کا ساتھ لازمی ہے یہ داخلی احساس وجدان اور ماورائی کیفیات ہی خدا کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ انسان کے اندر نئی کیفیات کو جنم دیتی ہے۔ جو بعد ازاں اس کو امکانات سے لڑنے کی ہمت عطا کرتی ہے اور اس کے لیے خوف، دہشت اور لایعنیت سے لڑنا آسان ہو جاتا ہے۔ داخلی کیفیات انتخاب کو آسان بناتی ہیں۔ یوں فرد کی فردیت اور آزادی برقرار رہتی ہے۔

وجودیت کا دوسرا بڑا گروہ الحادی وجودی مفکرین کا ہے جو خدا کے وجود سے انکاری ہیں وہ ایک طرف تو لگے بندھے رویوں اور نظاموں سے بغاوت کرتے ہیں تو دوسری طرف خدا کے وجود سے بھی منکر ہیں۔ انسان کے اندر پائی جانے والی لایعنی کیفیت بیزاری اور کرب نے انہیں لادینیت کی طرف دھکیل دیا یا پھر وہ زندہ خدا کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں جو ان کے دکھوں کا مداوا نہ کر سکے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے فلسفیانہ ذہن کے ساتھ خدا کی ذات سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ اس کے پیچھے بھی کئی ایک اسباب ہیں جو اس باغی روش کو اپنانے میں ان کو راستہ فراہم کرتے نظر آئے۔ مستند حکومتیں اور کلیسا کی اجارہ داری جنہوں نے عام

آدمی کی زندگی کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ فرد اپنی انفرادیت سے محروم ہوا۔ بھیانک جنگوں میں انسانی زندگی کی پامالی، اذیت اور موت کے رقص نے انسان کو اس قدر لایعنیت کا شکار کر دیا کہ اس نے مذہب پر سوال اٹھانے شروع کر دیئے کہ جب انسان پر ظلم ہو رہا تھا تو خدا کہاں تھا؟ وہ مفکرین جو الہیات کے دائرے میں رہتے ہوئے وجود کی بات کرتے ہیں وہ خوش نصیب ہیں کہ انہیں خدا اور مذہب کے دامن میں پناہ مل گئی جبکہ ملحدانہ روش رکھنے والے اپنے بہترین افکار و خیالات کے باوجود اپنے فلسفے اور اپنی ذات کو کوئی کنارہ نہ دے سکے۔ اور گومگو کی کیفیت کا شکار رہے۔ ان مفکرین میں ہائڈیگر، سارتر، نطشے اور کامیو شامل ہیں۔

ہائڈیگر (۱۹۷۶-۱۹۱۷)

مارٹن ہائڈیگر الحادی مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعاتی فکر بھی رکھتا تھا ہائڈیگر کے ہاں ہمیں ذات کی حتمی ماہیت کے سوالات بھی ملتے ہیں۔ اس نے فلسفے کا عمیق مطالعہ کیا حالانکہ وہ خود کو وجودی مفکر کہلوانے سے انکاری ہے۔ لیکن اس کے بنیادی افکار وجودیت کی کڑی ہیں۔ اس کے ہاں مظہر (Being there) اور وقت (Time) کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ہائڈیگر کہ خیال میں سائنس مظہر کا مطالعہ ہے۔ جب کہ فلسفہ ہمارے حواس یعنی جاننے والے اور جانے ہوئے سے ماوراء کا مطالعہ ہے۔ معروضی علم غیر معتبر جبکہ مابعد الطبیعیات مطالعہ معتبر ہوتے ہیں۔ ہائڈیگر ذات یا وجود کے لیے (DESEIN) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے ہاں جو وجود شعور اور آزادی انتخاب اور ذمہ داری کو برقرار رکھ سکتا ہے وہ معتبر ہے جبکہ ان سے فرار پانے والے وجود نا معتبر ہیں جس کا احساس انسان کو حقیقی دنیا، کائنات اور وجود میں جھانکنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں وقت اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ فرد اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے۔ اپنے اعمال پر نظر ثانی کرتا ہے اس میں احساس گناہ و ثواب جنم لیتا ہے۔ اس کے ہاں احساس زماں و ہستی کے حوالے سے بہترین موجودی مطالعہ نظر آتا ہے۔ جو اسے وجودی مفکر ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ کیوں کہ اس کے ذہنی ارتقاء میں نطشے اور کانٹ کا نمایاں کردار ہے۔ اس لئے اس کے ہاں بھی "مرگ خدا" کا تصور ملتا ہے۔ لیکن وہ اس اہم واقعہ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا اس کی مشہور تصانیف میں ہستی و زماں اور ہستی کے گڈریے شامل ہیں۔

نطشے (۱۹۰۰-۱۸۴۴)

یوں تو فریڈرک نطشے بھی کرکیگارڈ کی طرح عقلیت پرستی، سائنسی نظام، جدیدیت اور طے شدہ فکری نظاموں کے خلاف تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے مرگ خدا کا اعلان بھی کیا۔ حالانکہ نطشے کا دور یورپ کا سنہری عہد تھا۔ معاشی خوشحالی، سماجی اور سیاسی ٹھہراؤ اپنے عروج پر تھا۔ لیکن داخلی طور پر تہذیب و تمدن کے بکھراؤ کا دور تھا۔ پرانے نظاموں کی جگہ نئے نظاموں نے لے لی تھی۔ لیکن انسان تنہائی کا شکار ہونے لگا اس بے چینی اور اضطراب کے خاتمے کے لئے انسان نے روایتی مذہب کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن سکون نہ پاسکا اسی منظر میں ہمیں نطشے کی صدائے احتجاج بلند ہوتی دکھائی دیتی ہے جس نے فکری نظام پر تنقید کی نطشے جو کہ ایک جرمن پادری کے ہاں پیدا ہوا کڑے مذہبی ماحول میں پرورش پائی لیکن دنیا کے حالات و واقعات سے پالا پڑھنے کے بعد حالات یہاں تک آ گئے کہ نطشے مذہب سے متنفر ہو گیا۔ اس کے خیال میں صداقت کی تلاش اور طلب کے لیے جستجو ضروری ہے۔ جب عوام کو نطشے کے ان خیالات کا علم ہوا تو حالات بگڑنے لگے۔ اسے شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں اور نطشے میں شدید رقابت چلتی رہی لیکن اس نے جرمن اور فرانسیسی ادب کو بہت متاثر کیا۔ دنیائے مشرق میں بھی اس کے افکار کو پذیرائی ملی۔ جس کی وجہ اسلام کے افکار سے مناسبت اور شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے افکار سے مماثلت ہے کیونکہ نطشے کے تصور "فوق البشر" اور اقبال کے تصور "مرد مومن" میں کسی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ یوں انھیں دنیائے اخلاقیات کا مجرد رفارمر بھی مانا جاتا ہے۔ نطشے کے فلسفے کے دو حصے ہیں پہلا حصہ روایتی نظاموں کی نفی کرتا ہے جبکہ دوسرا حصہ عدمیت کے نتائج سے فوق البشر کی بنیاد رکھتا ہے۔ پہلا حصہ وجودیت کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہے۔ کرکیگارڈ اور نطشے میں یہی فرق ہے کہ کرکیگارڈ کو جیتے جاتے خدا کی تلاش تھی جبکہ نطشے کو زندہ انسان درکار تھا۔ لیکن دونوں فرد کی آزادی اور انفرادیت کی بات کرتے ہیں۔

ژاں پال سارتر (۱۹۰۵-۱۹۸۰)

ژاں پال سارتر انیسویں صدی کا ایک منفرد ڈرامہ نگار ادیب اور انسان دوست مفکر تھا۔ سارتر کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ علم کی حد اور فکر کس حد تک وسیع ہوتی ہے۔ سارتر نے زندگی کہ جس موضوع پر قلم اٹھایا ادب پرور لوگوں نے اسے سراہا اور قبول کیا۔ سارتر کی فکر نے پوری دنیا کے ادب پر اپنے اثرات مرتب کئے۔ اس نے اپنے فلسفے اور ادبی تخلیقات کے ذریعے کئی نئے سوالات کو جنم دیا۔ پیرس ایک عجیب و غریب شہر ہے جس کے چائے خانوں میں ادب کی روشنی میں نے جنم لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے مغرب کو روشن کر گئی۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی ساری کی ساری تحریکیں ہی سے پیدا ہوئیں

اور ساری دنیا میں پھیل گئی۔ وجودیت بھی اسی دور کی پیداوار ہے سارتر نے اعلی تعلیم سے فارغ ہو کر ایک مدرس کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اس نے وقت کے مشہور فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ ڈنمارک کے فلسفی سوزن کرکیگارڈ کے خیالات سے متاثر ہوا۔ جو کہ وجودیت کے بانی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ سارتر نے انسانی نفسیات پر تحقیق کی اور مضامین لکھنے شروع کیے۔ جس پر ادبی حلقے میں اسے بڑی پذیرائی ملی۔ ۱۹۳۵ میں اس نے اپنے پہلے ناول "Lananass" کو اپنے فلسفے کی مناسبت سے ترتیب دیا۔ جو کہ ادب کی دنیا میں ایک نئی دریافت تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں سارتر فرانسیسی فوج کا حصہ بنا اور نو ماہ تک نازیوں کی قید میں رہا۔ وہ قید میں بھی مسلسل لکھتا رہا۔ آزادی اور ظلم کے خلاف اس کا قلم مسلسل بر سر پیکار رہا۔ وجودیت کا فلسفہ پہلی بار سارتر کے ڈراموں میں دیکھا گیا۔ اس کی کتاب "Being and nothingness" میں وجودیت کے سارے پہلوؤں پر مفصل گفتگو کی گئی۔ Existintials and batman نامی پمفلٹ میں اس نے وجودیت کے حوالے سے اٹھنے والے اعتراضات کے جوابات دیئے۔ جن کی بدولت لوگوں نے وسیع پیمانے پر فلسفہ وجودیت کو جاننا اور سمجھنا شروع کیا۔ بلکہ یہ ایک تحریک کی صورت ابھرا مشرق اور مغرب میں لوگ سارتر کے فلسفے متاثر ہونا شروع ہو گئے۔ سارتر کو عالمی شہرت ملی۔ امریکہ میں سارتر کو شدید مخالفت اور تنقید کا سامنا رہا اس کی وجہ سارتر کی سیاسی مداخلت تھی کیونکہ امریکہ میں ادب تہذیب اور زندگی کو مارکسزم (اشتراکیت) کے پیمانے سے پرکھا جاتا تھا جبکہ سارتر مارکس کے نظریات کا شدید نکتہ چیں رہا۔ سارتر محض ایک فلسفی نہیں سماجی ادارہ ہے۔ ہم سارتر کی لادینیت سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس کے خیالات نے مغربی و مشرقی علمی، ادبی اور سیاسی فضا پر جو اثرات مرتب کی ہے ان سے منہ نہیں پھیرا جا سکتا ہے۔

سارتر کے نزدیک ایک محض لایعنیت، لادینیت کی طے شدہ نظام پر تنقید یا بغاوت کو وجودیت قرار دینے سے وجودی فکر کی اصطلاح اپنی وسعت اور مفہوم کھو دیتی ہے۔ فلسفہ وجودیت اپنے فکر اور صحت کے حوالے سے ایک الگ مقام رکھتا ہے جو کہ سارتر کے قول "وجود جوہر پر مقدم ہے پر مبنی ہے" جس پر تمام الہیاتی اور الحادی وجود مفکرین متفق نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں بختیار حسین صدیقی اپنے مضمون "وجودی مظہریت" میں لکھتے ہیں۔

> "وجودیوں کا دعوی ہیں کہ انسان کا وجود اس کی ماہیت پر مقدم ہے ابتدا
> میں انسان فقط وجود ہوتا ہے بعد میں ارادے اور عمل کی پوری آزادی

کے ساتھ وہ خود اپنی ماہیت کی تشکیل کرتا ہے۔ پس ماہیت سے مبرہ
انسان وجود وجودیت کی نظر میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔"(۱۴)

وجودیت کا مذہب سے کوئی منطقی تعلق نہیں ہے نہ ہی جزا سے انکار اس کے بنیادی فلسفے میں شامل ہے۔ یہ کسی بھی فرد کا ذاتی معاملہ ہے تو دیگر وجودی مفکرین جو مذہب سے جڑے رہے ان کے اثبات و انکار سے وجودیت کے فلسفے پر کوئی فرق نہیں پڑا البتہ سارتر کی وجودیت مذہب سے بیگانگی کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ ہر ایک کا اپنا کوئی نہ کوئی مذہبی رجحان ہوتا ہے اور ذہن و دل کے کسی گوشے میں ہر شخص اپنا کوئی نہ کوئی عقیدہ ضرور رکھتا ہے۔ جیسے سارتر کے نزدیک خدا کا ہونا نہ ہونا اہم نہیں مگر وہ بھی یہ کہتا ہے کہ خدا نہ ہوتا تو انسان ہوتا۔ فرد کے اخلاق اور فیصلوں کی ذمہ داری اس کی اپنی ہوتی اور وہ خود مختار ہوتا یعنی سب سے اہم انسان ہے اس کا اچھا یا برا ہونا بعد میں طے کیا جاتا ہے۔ ہمیں شے، فرد اور سماجی فرد کی ترتیب کو سامنے رکھ کر وجودیت کی تفہیم کرنی چاہیے۔ سارتر کے نزدیک زندگی ایک امکان ہے جو کسی لگے بندھے نظام یا رویے پر بنیاد نہیں کرتی۔ اگر معاشی و مادی وسائل کی پریشانیوں کو کم کر دیا جائے تو روایتی اخلاقی مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے اور یہ سب سیاسی اور سماجی تبدیلی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ سارتر کی بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے روایتی اور مروج عیسائیت کو خدا کا آخری تصور جان کر اس کی خامیوں کو دیکھتے ہوئے خدا کے وجود سے انکار کر دیا۔ فطری تقاضہ یہ تھا کہ وہ مزید تحقیق کے ذریعے یہ جاننے کی کوشش کرتا تھا کہ آیا خدا کا کوئی اور تصور بھی موجود ہے یا نہیں۔ سارتر اپنے متنوع اور متنازعہ موضوعات اور افکار کی بدولت ارسطو کے بعد عالمی ادب پر سب سے زیادہ اثرات مرتب کرنے والا فلسفی ہے۔ جس نے انقلابات اور دو عالمی جنگوں کا بغور مطالعہ کیا اور ان سے پیدا شدہ صورتحال پر تجزیہ کرتے ہوئے اپنے فلسفے کی مناسبت سے اس کی منظر کشی کی وہ اپنے قلم کے ذریعے موجودہ دور کے انسان کو موجودہ صورتحال سے نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی تحریر وجودی بحران کا سراغ لگانے اور ابلاغ دینے میں معاون ثابت ہوئیں۔ اپریل ۱۹۸۰ کو سارتر کے جنازے پر موجود جم غفیر نے ثابت کر دیا کہ وہ کتنی ہر دل عزیز شخصیت تھا۔

البرٹ کامیو (۱۹۱۳-۱۹۶۰)

البرٹ کامیو فرانسیسی ادیب ہے کامیو نے وجودی ہونے سے انکار کیا لیکن وہ جن افکار کو مانتا ہے۔ یا اپنی تحریروں میں جن مسائل کو پیش کیا وہ وجودی فکر کے مشابہ ہیں۔ کامیو کے ناول اجنبی، پلنگ، زوال، جلاوطنی و سلطنت اور ارسطوسی فس اس کے نمائندہ فکری شاہکار ہیں۔ سارتر سے گہری دوستی کے دنوں میں

سارتر کے نظریے کو وسعت دینے کی کوشش کی کہ دنیا لغو ہے۔ موت خودکشی اور عدمیت کے احساس جسے موضوعات کامیو نے سارتر، نطشے اور جرمن وجودیوں سے اثرات لیے دو خون ریز جنگوں نے فرانسیسی ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس تخریبی عمل نے علوم میں نئے اضافے کئے۔ روایتی اعتقادات ملیامیٹ ہوئے اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اسے بلا کسی جواز کے کائنات میں پھینک دیا گیا اور یہ زندگی بے مقصد اور لغو ہے۔

ایک فرد کی حیثیت سے کامیو نے اپنی ذاتی زندگی بھی ایسے حالات میں گزاری جو لغویت اور تنہائی کا شکار تھی۔ بچپن میں افلاس اور یتیمی کی ٹھوکریں، جنگ کا خوف اور پے در پے آنے والی مشکلات میں کامیو کو کئی ذہنی مراحل سے گزارا پھر اچانک ۱۹۶۰ میں اس کی حادثاتی موت نے اس کے افکار پر آخری مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کامیو دیگر فلسفیوں کی طرح انوکھی اور دقیق اصطلاحوں کا بوجھ لیے نہیں پھرتا۔ لیکن وہ اپنے وجودی افکار کی بدولت نمایاں مقام رکھتا ہے کامیو نے کائنات کی تخلیق، زندگی کی ماہیت، فرد کی تخلیق اور خالق کون؟ جیسے سوالات کی کھوج میں زندگی بسر کر دی۔ اس کی جستجو اور کھوج نے اسے لغویت کا شعور بخشا۔ کائنات کو سمجھنے کی شدید جدوجہد نے ہی لغویت کی فکر کو جنم دیا۔

شروع شروع میں کامیو کے ہاں زندگی کی لغویت کے حوالے سے جو شدید اور جارحانہ رویہ ملتا ہے وہ رفتہ رفتہ تبدیل ہوتا گیا منفی ہٹ دھرمی، خودکشی، اور موت کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے استحصالی اور جبری قوتوں کے خلاف اعلان جہاد کرنے کی ترغیب نظر آتی ہے جو کہ ایک مثبت طرز عمل ہے۔ اس طرح کولن ولسن کی نئی وجودیت کی تفہیم اور کوشش بھی مغربی وجودیت کا حصہ رہی۔ تقریباً سبھی مغربی ادیبوں نے جو کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں پیدا ہوئے وجودیت سے متاثر ہوئے یا بطور فیشن اسے اپنے فکشن کا حصہ بنایا انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک ۷۰ سے زائد ایسے ناول لکھے گئے جو وجودی فکر پر منحصر تھے۔ جن میں سارتر کے تین ناول آزادی کی راہیں، عقل کا رخانے، روح کی موت، یہودی ناول نگار کا ناول ٹائم آف ڈلفیرنس، کامیو کے ناول اجنبی، پلنگ اور ارسطوسی فس قابل ذکر ہیں۔ سارتر کے بے شمار ڈرامے جو کہ اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران لکھے سب میں وجودی فکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ کافکا، موپساں، اور چیخوف کے افسانوں میں بھی وجودیت کے عناصر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

سمیون دی بودار، کامیو، کافکا، آندرے ژید (سگمینڈ) فرائڈ اور سارتر یہ وہ نمایاں نام ہیں۔ جن کے ہاں ہمیں وجودیاتی فکر اور فلسفہ وجودیت کے عناصر واضح ملتے ہیں۔ بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی

جرمنی، فرانس اور برطانیہ میں وجودیت کے عروج کا زمانہ رہا۔ اسپین اور روس میں بھی اس فکر کو بہت پذیرائی ملی۔ تقریباً دنیا بھر میں سبھی وجودی مفکرین وجود کی بے ثباتی اور دنیا کی مہملتا پر متفق نظر آتے ہیں۔ وہ بے شعور دنیا کے خلاف اپنے وجود کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ کہیں قنوطی جذبے اور کبھی رجائی کیفیات کو ذریعہ اظہار بنایا گیا۔ مگر سبھی فلسفیوں اور ادیبوں کا بنیادی مقصد انسانی وجود کو ایک بہتر سمت عطا کرنا تھا۔

ii۔ وجودیت کے مشرقی تناظرات

مشرق کے بسنے والوں کو ہمیشہ سیاسی، سماجی اور اخلاقی انہدام کا سامنا رہا۔ آپسی جنگ وجدل، معاشرتی اور طبقاتی اونچ نیچ، اقتدار کی چھینا جھپٹی اور پھر بیسویں صدی طویل تاریکی میں گزری، غلامی اور نو آبادیاتی نظام نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو کرب و مصیبت میں مبتلا رکھا۔ غلامی کی ذلت، موت کا رقص، غربت و جہالت اور مجبوریوں نے فرد کو موضوعیت کی طرف راغب کیا۔ اس لیے مشرقی فرد کے ہاں وجودیاتی طرز فکر کا پایا جانا ایک عام فہم بات ہے۔ موضوعیت کے اسی رویے نے مشرق خصوصاً برصغیر کی اساطیری فضا اور تصوف پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ تصوف انسانی روح میں رچا ہوا ایک احساس ہے۔ یہ نا صرف اسلام بلکہ ہر ایک مذہب کا حصہ ہے۔ تمام مذاہب میں ہمیں صوفی ملتے ہیں یہ ایک تڑپ ہے جو فرد کو خالق کی طرف کھینچتی ہے۔ یہ ایک اضطرابی کیفیت ہے جو اللہ سے محبت، اس کے خوف، احکامات پر عمل کرنے اور کائنات پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود تصوف کے دو بڑے مکاتیب ہیں۔ وحدت الوجود نے کسی حد تک معاشرے کے ایک خاص طبقے کو متاثر کیا۔ مشرق میں بھی یہی رجحان رہا۔ اس پر مشرق کی اساطیری فضا نے اسے عجب امتزاج بخشا۔ یورپ کا فلسفہ تصوف بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے سے اصل حقیقت آشکار ہوتی ہے۔ اسلامی طرز فکر میں تصوف عین اسلام ہے مشرق میں کئی مشہور صوفیا کرام نے جنم لیا۔ اس حوالے سے یہ مٹی بہت زرخیز رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی دنیا کا ایک بڑا حصہ آج بھی مذہب، تصوف، روحانیت، اساطیر اور رسم و رواج کا پابند ہے۔ ان کے نزدیک مذہبی اقدار اور اخلاقیات آج بھی اہم ہیں۔ جیسے ایک دو صدی قبل تھی۔ مذہب کے نام پر آج بھی اتنے ہی شدید رویے دیکھنے کو ملتے ہیں جو صدیوں قبل تھے۔ ہر مذہب کے لوگ بستے ہیں جو اپنی تعلیمات اور اقدار کو دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ان رجحانات سے باغی ہو کر سائنس کی دنیا کا اسیر ہو چکا ہے۔ ان کے نزدیک مذہب سے بڑھ کر عقلی اور تجریدی دنیا ہے۔ فی زمانہ مشرق میں بھی حالات مغربی طرز فکر پر چل پڑے ہیں۔ انسان تنہائی کا شکار ہے۔ خاندانی نظام درہم برہم

ہو تا جارہا ہے۔ شہری زندگی نے اجنبیت کا ساماں پیدا کر دیا ہے انسان کا اعتماد اور اعتقاد دونوں ہی کمزور ہو چکے اور وہ صرف اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ فرد اجتماعی زندگی کے تقاضوں کو یکسر فراموش کر چکا ہے۔ یوں ایک اجتماعی بے مقصدیت نے جنم لیا۔

لیکن یہاں مذہب کا وہی پرانا نظام موجود ہے۔ اخلاقی اقدار موجود ہیں۔ خاندانی نظام کی جھلک بھی کہیں نہ کہیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ لوگ مشینی دور کے اسی طرح غلام ہیں جس طرح مغرب میں صنعتی ترقی نے زندگی میں اضطراب پیدا کر رکھا ہے۔ مشرق میں آج بھی مذہبی تصورات اور علامتوں کے ذریعے مابعد الطبیعاتی جہتوں کی کھوج جاری ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مشرقی فرد وجودی مسائل سے دوچار نہیں۔ ہر معاشرے میں ایسے افراد ضرور موجود ہوتے ہیں جو ایک منظم معاشرے میں رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ وہ معاشرتی ناانصافیوں اور جبر کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔ برصغیر پاک وہند ایک منفرد سرزمین رہی جو ایک عرصے تک دنیا سے الگ تھلگ رہی۔ ہندو متھالوجی نے یہاں ایک رنگارنگ تہذیب کو جنم دیا۔ جس کے رکھ رکھاؤ ضابطے اور رواج دوسری تہذیبوں سے قدرے مختلف ہیں۔ مغلیہ سلطنت کا عروج ہو یا بہادر شاہ کے زوال کی داستان، ناکام جنگ آزادی کی کوشش ہو یا نو آبادیاتی نظام کے اثرات چشم فلک نے انسانی بے توقیری کے وہ مناظر دیکھے جو ناقابل بیان ہیں۔ ظلم و جبر کا یہ سلسلہ تب سے اب تک کسی نہ کسی صورت جاری و ساری ہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال اور ۱۸۵۷ کی ناکام جنگ آزادی نے برصغیر کو غلامی، ابتری اور بے چینی کے گہرے کنویں میں دھکیل دیا۔ رہی سہی کسر برطانوی نو آبادیاتی نظام نے پوری کر دی۔ عوام کی اکثریت حکومت کے خوف میں مبتلا رہی اور ان کی ہمنوا بن گئیں۔ کچھ باغی ہوئے۔ انسانی وقار چھین گیا۔ فرد اپنی بقا اور شناخت کھو چکا تھا۔ یورپ کی سائنسی ترقی نے رفتہ رفتہ مشرق میں اپنا لوہا منوانا شروع کیا۔ برطانوی نو آبادیاتی نظام نے جہاں منفی اثرات مرتب کیں وہیں جدید سائنسی سہولیات بھی اپنے ہمراہ برصغیر لائے۔ ہندوستان ان کے لیے خام مال کی منڈی تھی۔ یہیں سے گیا خام مال جب تیار ہو کے دوبارہ ہندوستان پہنچتا اس کی قیمت اور اہمیت دگنی ہو چکی ہوتی تھی۔ نو آبادیاتی نظام کے ثمرات میں ہمیں برطانوی نظام تعلیم، نظام صحت، ذرائع ابلاغ، رسل و رسائل، ذرائع آمد و رفت علم و ادب سمیت تہذیب و تمدن کی منتقلی بھی نظر آتی ہے۔ مقامی باشندوں کے لیے یہ اچانک وارد ہونے والی تبدیلی پریشان کن تھی۔

بیسویں صدی میں ہندوستان میں ٹیلی فون، تار گھر، ریلوے، موٹر کار اور فنون لطیفہ سمیت کئی تیز رفتار عذاب ایک ساتھ نازل ہوئے۔ ایک طرف غلامی، جہالت اور غربت تو دوسری طرف زندگی میں بدلاؤ، ہندوستانی عوام اپنی ذات کے اثبات کے لئے فکر مند ہوئے۔ مالی مشکلات، غلامی کی زندگی اور جہالت کا دور دورہ تھا۔ مشرقی روایات اور علم کی جگہ مغرب کے جدید نظام نے لے لی تھی۔ یہ جذباتی ہیجان پتھل ہندوستانی عوام کے باشعور طبقہ پر گراں گزری۔ لیکن ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو زندگی کے اس بدلاؤ سے مرغوب ہوا۔ ان کا اعتماد اپنی روایات اور اعتقادات سے اٹھ گیا۔ یوں ہندوستان کی یہ نئی فضا عجب اضطراب اور کشمکش کا شکار تھی۔ ۱۹۱۴ کی پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ شامل تھا تو برطانوی نو آبادی ہونے کی وجہ سے ہندوستان بھی شامل تھا کیوں کے آقا کی جنگ ہمیشہ محکوم ہی لڑتے ہیں۔ ۱۹۱۴ کی جنگ میں ہندوستان سے ۶۸۳۰۰۰۰ فوجی بھیجے گئے۔ جن میں سے ہزاروں کو اپنے وطن کی مٹی بھی نصیب نہ ہوئی اس کے علاوہ جدوجہد کی مختلف تحریکوں میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔ کئی ایک باغی ہو کر حکومت وقت کی سزاؤں اور بربریت کا شکار ہوئے۔ ۱۹۳۹ میں دوسری جنگ عظیم میں بھی ہندوستان سے جبری فوجی بھرتیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس جنگ میں بھی ہندوستان کے ۱۰۹۰۰۰ ہزار نوجوان کام آئے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو قرارداد پاکستان منظور ہوئی آزادی کے حصول کی جنگ شروع ہو چکی تھی لوگ مر رہے تھے۔ انگریز اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو بچانے کے لئے حربے استعمال کر رہا تھا اور بے مقصد ہندوستانیوں کا خون بہہ رہا تھا۔ ۱۹۴۳ میں قحط اور کال نے بنگال اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں لاکھوں انسانوں کی جان لے لی۔ ۱۹۴۵ میں دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا تو ہندوستان میں کھلبلی مچ گئی۔ عوام میں باغیانہ روش نے جنم لیا۔ فرد کی ذات میں موجود مایوسی اور بیگانگی نے اسے اثبات ذات کے لیے جدوجہد کی طرف راغب کیا کیوں کہ جب فرد میں آزادی حاصل کرنے کی قندیل روشن ہوتی ہے تو اسے اپنا ہدف حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ آزادی کا یہ شعلہ بجھ نہ سکا اور آخر کار ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو انگریز سامراج کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ یوں پاکستان کے قیام اور ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوا۔

آزادی اور قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی تقسیم اور ہجرت کے دکھ نے آلیا۔ رہی سہی کسر ہندو مسلم فسادات نے پوری کر دی۔ پاک بھارت سرحدیں انسانی خون میں ڈوب گئیں۔ قتل و غارت کا ایسا بھیانک دور تاریخ انسانی میں شاید ہی دوبارہ دیکھ سکے۔ ہزاروں عورتیں اغوا ہوئی، سینکڑوں کی عصمت دری ہوئی، املاک گھر بار تباہ، محرومی اور مجبوری کی ہزاروں داستانیں آج بھی پاکستان کے گلی کوچوں میں سنی جاسکتی ہیں۔ لٹے پٹے قافلوں یہاں وسائل اور ذرائع کی کمی، بھوک اور افلاس کا نیا دور آنے والوں کا منتظر تھا۔ مہاجرین کی آبادکاری

ناپید حکومتی ڈھانچہ اور دیگر گوناگوں مسائل قائداعظم نے اپنی سیاسی حکمت عملی اور بصیرت سے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ اتنا آسان نہ تھا مہاجرین کا رہن سہن مقامی آبادی سے میل نہ کھاتا تھا۔ اس لیے ایک اجنبیت اور بیگانگی نے جنم لیا۔ فرد جو کہ اپنی ذات کے اثبات اور آزادی کے لیے دربدر ہوا تھا ایک نئی قید کا شکار ہوا۔ مختلف النوع ثقافتوں اور کثیر لسانی مسائل قومی زبان کے سوال پر ہنگامی شروع کر دیئے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ قائداعظم کی وفات نے ملکی سیاست کو بڑا دھچکا دیا۔ ۱۹۵۱ میں لیاقت علی خان کو راولپنڈی جلسہ عام سر عام قتل کر دیا گیا مشرقی پاکستان میں ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل ہوئی۔ ۱۹۴۷ تک اقتدار کی چھینا چھپٹی کا بہیمانہ کھیل کھیلا گیا۔ عوام میں اضطراب اور بے چینی تھی وہ بنیادی سہولیات سے محروم ہو چکے تھے۔ ہوس اقتدار نے نئے حکمرانوں کی غیرت کو ختم کر دیا۔ اخلاقی اقدار اور مذہب کی تقدس بھی سوالیہ نشان کی زد میں آ چکے تھے۔ جون ۱۹۶۲ میں آئین نافذ کیا گیا۔ ۱۹۶۵ میں انتخابات اور پھر پاک بھارت جنگ میں سینکڑوں فوجی مارے گئے۔ جنگ کا آغاز و اختتام آج بھی ایک معمہ ہے۔ ۱۹۶۷ اور پھر ۱۹۶۹ کا مارشل لاء اور عوام بدترین آمریت کے چنگل میں پھنس گئے مشرقی اور مغربی پاکستان عجب خانہ جنگی میں مشغول تھے۔ ۱۹۷۰ کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی۔ جب کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نمایاں رہی۔ بھارت کے اوچھے ہتھکنڈے اور مداخلت سے انتشار بڑھا اور خانہ جنگی کی صورتحال پیدا ہو گئی۔ ۱۹۷۱ میں پاکستان دولخت ہوا۔ ایک مایوسی اور ناامیدی نے فرد کی ذات کو گھیرا۔ ۱۹۷۱ میں جرنل یحییٰ نے سب لٹا کر اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کو سونپ دیا۔ پاکستان کا پانچ ہزار مربع میل علاقہ اور ۹۳ ہزار پاکستانی ہندوستان کی قید میں تھے۔ بھٹو نے پاکستان کو مایوسی سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی ۱۹۷۳ کا آئین منظور ہوا۔

۵ جون ۱۹۷۷ کو جنرل ضیاء الحق نے پھر مارشل لا نافذ کر دیا بھٹو گرفتار ہوئے۔ سمری ملٹری کورٹس بنیں۔ قید اور کوڑوں کی سزائیں عام ہوئیں۔ عوام خوف و ہراس میں مبتلا ہوئی۔ نوے دن کا کہہ کر گیارہ سال گزار دیئے گئے۔ بھٹو کو پھانسی دی گئی جس کے نتیجے میں ملک گیر احتجاج ہوئے یہ ریاستی جبر کا بدترین دور تھا۔ ۱۹۸۱ میں نظام مصطفیٰ کا قیام عمل میں لانے کی کوشش کی گئی جو منافق چہروں کی گھناؤنی سازش کے سوا کچھ نہ تھی۔ روس نے افغانستان میں مداخلت کی تو امریکہ نے پاکستان کو تختہ مشق بنایا تاکہ روس کو افغانستان سے بے دخل کیا جائے۔ مہاجرین کا ایک سیلاب پاکستان میں وارد ہوا۔ منشیات اور اسلحہ عام ہوا۔ دہشتگردی عام ہوئی۔ پورا ملک خوف، کرب اور انتشار کا شکار ہوا۔ ۱۹۸۵ سے ۱۹۹۹ تک حکومتیں بنتی ٹوٹتی رہیں۔ کرپشن اور بدعنوانی اپنے عروج پر رہی۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ میں جنرل پرویز مشرف نے حکومت سنبھالی مارشل لاء تو نافذ نہ کیا مگر آئین

کی کی دفعات کو معطل کر دیا گیا۔ بیسویں صدی کے آخری سالوں میں پاکستانی معاشرہ شدید انتشار کا شکار رہا اقتدار کی ہوس، لانگ مارچ، ہڑتال، مہنگائی اور دہشت گردی نے عوام کے سکھ چین کو برباد کیے رکھا۔ کسی کی جان، عزت اور مال محفوظ نہ تھی۔ سماجی فضا شدید بے حسی اور احساس بیگانگی کا شکار تھی۔ معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ایک اپر کلاس اور دوسرا غریب طبقہ جو ظلم کی چکی میں پستا رہا۔ رشوت اور سفارش کا دور رہا بے راہ روی اور بے سمتی اپنے عروج پر رہی۔ مہنگائی اور بے روزگاری نے جرائم اور جنسی تشدد کے واقعات میں اضافہ کیا۔ مذہبی جنونیت کو فروغ ملا۔ اس ضمن میں روزنامہ نوائے وقت اپنے اداریے میں لکھتا ہے:

> "اعراض و مفادات کو بالادستی حاصل ہے۔ معاشرے میں اسلام کی جھلک نمایاں ہے نہ جمہوری و سیاسی اقتدار کی فرمانروائی ہے نہ ویلفیئر اور فلاح و بہبود کے تصورات پر عملدرآمد نظر آتا ہے۔ عام آدمی غیر یقینی صورتحال میں گرفتار ہے اقتدار کے عناصر ترکیبی باہم دوبدو ہیں اور عدم تحفظ ایسا ہے نہ گھر میں اطمینان نہ سڑک محفوظ نہ دفتر اور کارخانے میں کہیں جائے اماں"(۱۵)

آبادی میں اضافہ ہوا کثرت سے اضافہ ہوا۔ موت کی ارزانی نے بے یقینی میں اضافہ کیا انسان بے وقت ہوتا گیا۔ یہ انتشار فرد کی ذات کے لیے اذیت ناک ثابت ہوا۔ جو اس دور کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔

iii۔ اردو افسانہ اور وجودیت

گزشتہ بیان کیے گئے احوال کی روشنی میں اگر برصغیر مشرق کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی فضاء کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہے کہ چاہے تقسیم ہندوستان سے پہلے کے واقعات ہوں یا قیام پاکستان کے بعد کی زندگی ہر دو صورتوں میں مشرقی فضا انتشار اور بحران کا شکار رہی جس نے فرد کو گہرے وجودیاتی کرب سے روشناس کرایا۔ اگر وجودیاتی فکر اور اس کے تناظرات کی بات کریں تو مشرق میں پچھلی ڈیڑھ صدی سے جو حالات رہے فلسفہ وجودیت کا مشرقی ادب پر اثر ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔ خاص کر اردو کلاسیکی شاعری میں ہمیں بے شمار موضوعی رویے ملتے ہیں۔ دہلوی اور لکھنوی شعرا نے کہیں نہ کہیں اپنے کلام میں فلسفہ وجودیت کو جگہ دی۔ یوں اردو شاعری میں موضوعیت کی روایت آگے بڑھتی رہی بعد میں اقبال کے ہاں موضوعیت اور وجودیت کے عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔ نطشے کے فلسفے سے اقبال کا مرعوب ہونا، اقبال کا تصور مرد مومن اور

نطشے کا تصور فوق البشر کہیں ناں کہیں میل کھاتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کا اپنی کتاب "امیر فکر و تخیل نطشے اعظم کے نام" میں نطشے کو خراج تحسین پیش کیا۔ میر اجی نے اپنی کتاب "مشرق و مغرب کے نغمے" میں مغربی شعراء کے رجحانات پر مفصل گفتگو کی۔ مجید امجد کے کلیات میں ہمیں مغربی شعرا کی نظموں کے تراجم ملتے ہیں جو اس بات کی گواہی ہے کہ ہمارے شعراء بین الاقوامی ادب کے مزاج سے واقف تھے۔

نو آبادیاتی نظام کے ساتھ جہاں دیگر ثمرات برصغیر پہنچے وہیں ادب اور اصناف بھی برصغیر کے ادب کا حصہ بنیں۔ دنیا میں چھپنے والی کتب با آسانی مشرق میں میسر آنے لگیں۔ انہی کتابوں کی بدولت جدید فلسفیانہ رجحانات مشرق پہنچے۔ دوسری جنگ عظیم میں سارتر کا نام تمام دنیا میں مقبول ہوا تو اس کے افکار کو مشرقی مفکرین نے نیا مفہوم دینے کی کوشش کی۔ اقبال کے بعد آنے والے شعراء کے ہاں بھی موضوعی رویے بکثرت ملتے ہیں جن میں جوش ملیح آبادی، میر اجی، ن م راشد، احسان دانش، مجید امجد، باقر صدیقی، شکیب جلالی، وزیر آغا، فانی بدایوانی، مجاز، اصغر گونڈوی، اعجاز فاروقی، رشید نثار، ضیاء جالندھری، عرش صدیقی، معین تابش، اثر صہبائی، قیوم نظر احمد شمیم، اور رفیق سندھلوی سمیت کی نامور شعرا موجود ہیں۔ جنہوں نے غزل اور نظم کے ذریعے زندگی کے موضوعی رویوں پر بات کی۔ ان کے ہاں زندگی کے کرب، لغویت، بیگانگی اور موت کے خوف کا گہرا احساس موجود ہے۔ اردو شاعری کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں سوچ شعور اور آگہی کے حوالے سے ایک گہرا یقین پایا جاتا ہے اور فرد کی انفرادی زندگی کو اہمیت دی گئی۔ اردو زبان و ادب میں وجودیت اور اس کے مفکرین کا شہرہ ۱۹۵۰ سے ۱۹۶۰ کی دہائیوں میں ہوا۔ خاص کر سارتر کے افکار نے ہمارے شعرا اور ادبا کو بہت متاثر کیا۔ اس حوالے سے وجودیت کے موضوع پر چند مضامین ہمارے سامنے آئے جن کا تذکرہ لازمی ہے۔

ممتاز حسین نے وجودیت منظر و پس منظر کے حوالے سے ۱۹۶۰ میں ایک مضمون لکھا جو فنون لاہور میں شائع ہوا اس شمارے میں سید عبداللہ کا مضمون "کیا اقبال وجودی تھے"؟ شائع ہوا ۱۹۷۳ میں سید شاہ احمد سعید ہمدانی کا مضمون "نظریہ وجودیت اور ادب" وزیر آغا کی ادبی رسالے اوراق میں چھپا۔ جس میں مضمون نگار نے لکھا کہ ادبی فن پاروں۔ میں کہیں نہ کہیں وجودیت کے اثرات نظر آنے لگے ہیں لیکن رسالہ کے ایڈیٹر نے جواب میں لکھا کہ یہ اثر خاصا نمایاں ہے اور اسے ایک الگ مطالعے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ سی اے قادر، جاوید حسین قاضی، شیخ ظہور الحق، ظفر احمد صدیقی، پروفیسر بختیار حسین صدیقی ڈاکٹر جمیل جالبی رضی عابدی اور ممتاز حسین سمیت کئی بڑے مفکرین نے فلسفہ وجودیت پر کتب اور مضامین لکھے۔ ان

میں سے بیشتر نے مغربی وجودی مفکرین کے مضامین اور کتب کا ترجمہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر وجودی ادیبوں کے شاہکار فن پاروں کا ترجمہ کیا گیا جن میں سارتر کافکا، چیخوف اور کامیو شامل ہیں یہ سب کام ۱۹۶۰ سے ۱۹۹۰ کے درمیانی عرصے میں ہوا۔ ان کتب اور مضامین کا فائدہ یہ ہوا کہ بڑے پیمانے پر ادبی دنیا میں وجودیت اور اس کے عناصر کو اپنی تحریروں میں سمونے کی کوشش کی گئی۔ شاعری کی طرح صنف نثر میں بھی ہمیں وجودیت اور موضوعیت کے حوالے سے بہت مواد ملتا ہے۔ اردو ادب کے بڑے ناول نگار اور افسانہ نگاروں کے ہاں ہمیں موضوعی رجحانات ملتے ہیں۔ خاص کر تقسیم، ہجرت، جنگ، مارشل لاء اور اقتدار کی ہوس نے جو سماجی اور سیاسی ابتری پیدا کی اس بحرانی صورتحال نے ہر باشعور فرد خصوصا ادیب کو بہت متاثر کیا۔ اور پھر اس نے ان لگے بندھے رواج اور نظاموں کے خلاف جہاد بالقلم کیا۔ اردو ادب ایسے بے شمار شاہکار فن پاروں سے بھرا پڑا ہے جن میں ہمیں وجودیاتی کرب، فرد کی انفرادیت اور شناخت کے حوالے سے واضح رجحانات نظر آتے ہیں۔ ہمارے فکری رجحان اس قدر تعصب کا شکار ہیں کہ پہلے پہل ہم مغرب کے خیالات اور فلسفوں کو گھٹیا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کچھ عرصے بعد انہی تصورات کو اپنا لیتے ہیں۔ وجودیت بھی ایسا تصور تھا جسے اپنانے میں ہمارے مفکرین نے وقت لیا۔

ہمارے جن نثر نگاروں نے وجودی فکر کو جانے انجانے میں اپنایا ان میں ناول نگار اور افسانہ نگار دونوں شامل ہیں۔ جنہوں نے ہجرت اور تقسیم کے دکھ، مارشل لاء سے پیدا شدہ سیاسی عدم استحکام اور معاشرتی رویوں میں فرد کی بے توقیری جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ان میں راجندر سنگھ بیدی، اے حمید، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، نسیم حجازی، انتظار حسین، عبداللہ حسین، اشفاق احمد، فاطمہ ثریا بجیا، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی سعادت حسن منٹو، غلام عباس، انور سجاد، منشایاد، محمد حمید شاہد، صدیق عالم، سجاد ظہیر اور پریم چند سمیت کئی نامور نثر نگار شامل ہیں جنہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں زندگی کی لاحاصلی اور لایعنیت کو موضوع بنایا۔ پاکستان کے بہت سے فلسفیوں نے اس تحریک پر توجہ دی۔ علمی و ادبی حلقوں میں اس کی مقبولیت رہی۔ ادبی حلقوں اور دانشوروں نے اس کے خاطر خواہ اثرات قبول کیے۔ قاضی جاوید حسین اردو ادب میں وجودیت کی مقبولیت کے اسباب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "پاکستان بحرانوں کا ملک ہے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی بحران پہلے دن سے اسے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وجودیت خود بحران کا فلسفہ ہے اس لیے یہاں اس کے لیے سازگار ماحول ہے۔ وجودیت جدید ترین

اور مقبول مغربی فلسفہ ہے اس لیے فیشن کے طور پر بھی اس میں کشش موجود ہے"۔ (۱۶)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بیسویں صدی کے بحران اور انتشار نے مشرق خصوصاً بر صغیر جو بعد ازاں پاکستان اور بھارت کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اپنے حالات و واقعات، سیاسی و سماجی عدم استحکام، کشت و خون، تقسیم اور ہجرت کا دکھ، معاشی عدم مساوات اور سائنسی ترقی، کی بدولت بے حد اذیت ناک وقت گزارا۔ جس کی بنا پر فرد نے موضوعیت کے دامن میں پناہ لی۔ ہمیں مشرقی ادب میں نظر آتا ہے۔ اردو ادب میں وجودی رجحانات کی موجودگی جدید فکری رجحانات اور عالمی فلسفے سے جڑے رہنے کی ایک کڑی ہے۔

گزرتے وقت کے ساتھ معاشی و معاشرتی مسائل میں اضافہ ہوا تو واقعات بڑھ گئے اور ادبی و اخلاقی معیارات کے رجحانات بھی بدلنا شروع ہو گئے۔ طویل داستان جو نسل در نسل چلتی آ رہی تھی ان کی اہمیت کم ہونا شروع ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ وقت کی کمی تھی۔ ڈیڑھ صدی پہلے جب برطانوی آبادیات کا راج تھا دیگر اثرات و ثمرات کے ساتھ ادبی اصناف نو آبادیات تک پہنچی اور مقامی زبان و ادب کا حصہ بنیں۔ یہی صورتحال مشرقی ادب میں بھی رہی۔ داستان کی جگہ ناول جو کہ حقیقی واقعات سے لیے کر مکمل کہانی کی صورت میں معاشرے کی عکاسی کرتا تھا نے لی۔ ناول کے ساتھ ساتھ ہی افسانہ (Short Story) کی صنف بھی انگریزی ادب سے اردو ادب کا حصہ بنیں اور یہاں کی رنگارنگ تہذیب میں سمو گی۔ افسانہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ معیاری ادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ وقت کی بحث بھی ہو جاتی ہے

انگریزی صنف (Short Story) اردو ادب میں افسانہ کے نام سے جانی جاتی ہے افسانہ سے مراد داستان، قصہ، جھوٹی بات ہے۔ زندگی سے جڑے کسی مخصوص پہلو کو اس طرح بیان کرنا کہ وہ واضح ہو سکے اور بھرپور تاثر چھوڑے افسانہ کہلاتا ہے۔ وقار عظیم اپنی کتاب "فن افسانہ نگاری" میں افسانے کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

> " مختصر افسانے میں واقعات کی تفصیلات اتنے اختصار ایجاز کے ساتھ بیان کی جاتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس کا ایک (واحد) تاثر قبول کرے۔ مختصر افسانہ ایسا ہونا چاہئے کہ اسے آدھے گھنٹے میں پڑھا جا سکے مختصر افسانے میں کوئی واضح آغاز اور انجام نہیں ہوتا"۔ (۱۷)

افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کرتا ہے اس پر وحدت تاثر کا عنصر نمایاں رہتا ہے افسانہ کا دورانیہ مختصر ہوتا ہے اسے ایک ہی نشست میں پڑھا جاسکتا ہے۔ افسانے کے عناصر میں موضوع، وحدت تاثر، تخیل، پلاٹ ،نقطہ، عروج (کلائمیکس) جامعت، اختصار اور اختتام شامل ہیں۔ افسانے کا آغاز ڈرامائی شکل میں ہوتا ہے تاکہ دلچسپی برقرار رہے۔ کہانی کو شروع سے آخر تک ایک ہی ربط میں بیان کیا جاتا ہے۔ اختتام بھی ڈرامائی ہونا چاہیے۔ افسانے کی یہ خاصیت ہے کہ وہ کبھی مکمل نہیں ہوتا قاری اپنی علمی استعداد اور فکر کے مطابق اس سے نتیجہ اخذ کرتا ہے آخر میں ایک تشنگی کا رہ جانا ہی افسانے کی کامیابی ہے۔ افسانے کا تعلق کسی ایک آدمی، قوم یا مذہب تک محدود نہیں۔ یہ فطرت کا ترجمان ہوتا ہے۔

مغرب کے زیر اثر بیسویں صدی میں مختصر افسانے کا آغاز ہوا۔ یوں اکیسویں صدی میں افسانے کا سو سالہ سفر مکمل ہوا۔ اس طویل سفر میں افسانہ کی منزلوں سے گزرا۔ جس کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک، ترقی پسند مصنفین، تقسیم کے بعد (جدیدیت) جبکہ آخری دور ستر کے بعد کا ہے جس میں پرانے تجربات سے استفادہ کرکے افسانے کو نیا رنگ و آہنگ دیا گیا۔

اردو افسانے کی تعریف بھی اب ناگزیر ہوتی جارہی ہے کیونکہ یہ اتنے تجربات سے گزر چکا کہ اس کی اصل شکل اور ہیئت بدل چکی ہے۔ اردو افسانے کی خصوصیات گنوائیں جاسکتی ہیں۔ اسلوب اور موضوعات کے لحاظ سے جیسے اسلوب یا تکنیک میں علامتی و تجریدی، داستانوی، دیو ملائی، اساطیری تمثیلی اور تصوراتی انداز نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ مرکب اور پیچیدہ پلاٹ، نثر میں شعری زبان کا استعمال، شعور کی رو اور تلازمہ خیال جیسی خصوصیات بھی دیکھی جاسکتی ہیں جبکہ موضوعات میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، داخلی مسائل و معاملات سمیت عالمی منظرنامے پر ابھرنے والی تحریکوں اور فلسفوں کو بھی کہانی میں سمونے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ روایتی طرز کے افسانوں سے گریز کیا جارہا ہے اور یہ انحراف افسانہ نگاروں کی شعوری کوشش ہے۔ افسانہ اپنے چوتھے کھونٹ میں داخل ہوچکا ہے۔ یہ افسانے کے تجرباتی کھونٹ کا ذکر ہے۔ پچھلی صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک افسانہ تین کھونٹ تک رہا۔ یعنی ترقی پسند تحریک کے ماننے والوں تک وہی روایتی افسانہ لکھا جاتا رہا۔ منٹو نے پہلی بار روایات سے انحراف کرتے ہوئے نئی طرز پر افسانے لکھنے کی کوشش کی۔ ان کی دیکھا دیکھی کئی لکھاری اس روش پر چلے۔ اسلوب، انداز اور مروجہ اصول وضوابط بدلتے گئے۔ افسانے پر کئی تجربات ہوئے تجریدیت کے ذریعے دینی مسائل اور عرفان ذات کے مسائل پر بات کی گئی جبکہ علامتی انداز میں زندگی کے مسائل اور الجھنوں کو تہہ دار عبارت میں لپیٹ کر پیش کیا گیا۔ گو کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانے

کی موجودہ شکل علامتی اور تجریدی ہے۔ جبکہ نئے افسانے میں کہیں کہیں شعور کی رو کی تکنیک بھی استعمال کی گئی۔ شعور کی رو سے مراد جو بات ذہن میں آئے براہ راست بیان کر دی جائے۔ اس طرح تمام تر کیفات کا احاطہ ممکن ہے۔ شعور کی رو نے افسانے کو براہ راست متاثر کیا کیونکہ اس میں افسانے کو نئے خیالات اور تصورات عطا کیے۔ جبکہ اس کے برعکس سر یلزم بنا کسی پابندی کے خیالات کا آزادانہ اظہار ہے۔ شعور اور سر یلزم میں ایک نقطے کا فرق ہے۔ شعور کی رو صدیوں کے سفر پر محیط ہے جبکہ سر یلزم مخصوص گزرے وقت کو گرفت میں لاتا ہے یہ افسانہ نگار کی ذاتی سوچ پر منحصر ہے کہ وہ افسانے کی کس تکنیک کو استعمال میں لاتا ہے۔ لیکن جلد ایسا ہو گا کہ بیانیے اور پلاٹ سازی پر دوبارہ توجہ دی جائے گی۔ ڈاکٹر انور سدید اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

> " آزادی کے بعد پاکستان میں افسانہ نگاروں کی جو نئی کہکشائیں مرتب ہوئی وہ ناولوں اور افسانوں کے اعتبار سے اب تک وسعت پذیر ہیں۔ گزشتہ پچاس سالوں کے عرصے میں اردو افسانے میں نو بہ نو تجربات آزمانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ اتنے نام سامنے آگئے ہیں جن کی خدمات بے حد دقیع سہی لیکن ابھی زمانے نے ان کے کام پر مہر دوام ثبت نہیں کی "۔ (۱۸)

یہ بات واضح ثبوت ہے کہ پچھلے پچاس ساٹھ برس میں اردو افسانے پر بے شمار کام ہوا۔ کئی نئے لکھنے والوں نے کمالات کیے۔ اور اپنے ارد گرد اور بین الاقوامی سطح پر اٹھنے والے تنازعات کو موضوع بنایا۔

فلسفہ وجودیت کسی جغرافیائی حدود کا پابند نہیں نہ ہی کسی ایک خطے یا براعظم تک محدود ہے۔ اس کا دائرہ کار ہر باشعور خطے اور فرد تک پھیلا ہوا ہے جہاں جہاں تہذیبی بحران پیدا ہوا وہیں وجودی فکر نے جنم لیا۔ جہاں انتشار، بے مقصدیت اور سائنسی زندگی نے اپنا سایہ کیا وہیں فرد کی انفرادیت، آزادی اور موضوعی زندگی کو خطرہ لاحق ہوا اور کئی موضوعی اور داخلی رجحانات نے جنم لیا۔ ہمارا خطہ بھی ایسی ہی کیفیات کا شکار رہا تو کیسے ممکن ہے کہ یہاں کا ادیب اور شاعر ان رجحانات سے نا آشنا رہے اور وجودیت تو ایسا موضوع ہے جو کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر فرد کی زندگی میں رچا بسا ہوا ہے۔ اسے حالات کا جبر کہا جائے، وقت کی ضروریات یا مغربی فلسفے کی پیروی و تقلید کا نام دیا جائے کچھ بھی ہو بحران، اضطراب اور زمانی مسائل نے ہمیں بھی وجودی فکر کی زد میں لا کر کھڑا کر دیا۔ وحید اختر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"جن محسوسات کو وجودیت نے فلسفے کی شکل دی وہ ہم سب کے تجربے کا جزو ہیں۔ یہ سمجھنا کہ ہندوستان کے ادب میں جدیدیت اور وجودیت درآمد کیے گئے میلانات ہیں ادب کے ساتھ ناانصافی ہے اور ان تمام معاصر رجحانات کے ساتھ بھی زیادتی ہے جو تمام کرہ ارض کے انسانوں کو فکری طور پر متحد کرتے ہیں"۔ (۱۹)

ہندوستان میں بھلے فلسفہ وجودیت تقسیم اور آزادی کے بعد وارد ہوا ہو لیکن شاعری اور افسانے میں ہمیں جابجا وجودی عناصر ملتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ وہ بحرانی کیفیات ہیں جنہوں نے وجودی اثرات کے لئے راہیں کھول دیں۔ بعض لکھاریوں نے بطور فیشن اس رجحان کو اپنایا بعض کے ہاں یہ لاشعوری طور پر دکھائی دیتی ہے کیونکہ انہیں وجودیت کی خبر بھی نہیں لیکن ان کی تحریروں میں وجودی عناصر پائے جاتے ہیں۔ جیسے اولین افسانہ نگار پریم چند کو لیا جائے تو پریم چند نے جب افسانہ "کفن" لکھا تو اردو ادب میں ابھی وجودیت کے مباحث نہیں چھیڑ گئے تھے لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ "کفن" وجودی افسانہ نہیں ہے۔ ۱۹۳۳ میں سجاد ظہیر کا شائع کردہ افسانوں کا مجموعہ "انگارے" وجودی طرز فکر سے لبریز تھا۔ جو کہ فرسودہ نظام سے بغاوت، استحصال اور جبر کے خلاف ایک آواز تھی۔ ان تمام افسانوں میں داخلیت کا عنصر نمایاں ہے جو کہ وجودی فکر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ سجاد حیدر کا افسانہ (دلاور پھر یہ ہنگامہ) زندگی کے کرب اور بے بسی کے موضوع پر ہے احمد علی کی کہانی (بادل نہیں آتے) بھی ایک خود کلامی ہے جو جبر کے خلاف لکھی گئی۔ انگارے میں جس کے باک رویے کی بنیاد رکھی۔ منٹو نے اسے برقرار رکھا ناقدین نے منٹو کے حق میں اور اس کے خلاف بہت کچھ لکھا۔ بعض نے اسے مغربی افسانہ نگاروں کے مقابل لا کھڑا کیا اور بعض اس کے جنسی موضوعات پر تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔ کچھ لوگ منٹو کے افسانوں کو جدیدیت سے جوڑتے ہیں لیکن اس کے ہاں زندگی کا کرب، انفرادیت کی خواہش، گھن، اکتاہٹ اور لایعنیت کے عناصر موجود ہیں۔ جو اس کے افسانوں کو وجودی رنگ دیتے ہیں۔ اس کے مشہور افسانے (ہتک، بو، ٹیرھی لکیر، ٹھنڈا گوشت، ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو دھواں، خالی ڈبے اور خالی بوتلیں اور پھندے) اگر انہیں وجودی تناظر میں دیکھا جائے تو مجبوری، کرب، اکتاہٹ، تنہائی، لایعنیت کی مقصدیت اور خواب جیسی داخلی وارداتیں ملتی ہیں۔ اس طرح راجندر سنگھ بیدی کے افسانے (اپنے دکھ مجھے دے دو، صرف ایک سگریٹ) میں بھی وجودیت کے اثرات ملتے ہیں قرۃالعین حیدر کے افسانے روشنی کی رفتار، فوٹوگرافر، آوارہ گرد میں وجودی عناصر ملتے ہیں۔ انتظار حسین (شوق، منزل مقصود،

سیڑھیاں، آخری موم بتی، اندھی گلی) میں بے شمار موضوعی رجحانات ملتے ہیں۔ سریندر، پرکاش، غیاث احمد، اقبال مشن کے ہاں بھی معنویت سے بھرپور افسانے ملتے ہیں۔ لیکن اگر پہلے باقاعدہ وجودی افسانہ نگار کی بات کی جائے تو ہمیں کلام حیدری کی کہانیوں میں داخلی موضوعات ملتے ہیں۔ صاف اور واضح اسلوب کے ساتھ باقاعدہ وجودی عناصر کو برتا ہے۔ کلام حیدری نے وجودیت اور وجودی فلاسفروں کو باقاعدہ پڑھا اور ان کے رجحانات کو اپنے کلام کا حصہ بنایا۔ جس کا ذکر وہاب اشرفی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ان کا افسانہ صفر، اسیر، حادثہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ زرد، واپسی، بھیک، آوازیں حاشیائی آدمی اور نوع کا بیٹا بھی وجودی افسانوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ انور عظیم، رتن سنگھ، ظفر اوگانوی، شوکت حیات قمر امن، انور خان، سلام بن رازق، رضوان احمد، مجید انور، حمید سہروردی سے لے کر رشید امجد، تک سینکڑوں افسانہ نگار ایسے ہیں جنہوں نے علامتی اور تجریدی پیرائے میں وجودی عناصر کو اپنے افسانوں کا حصہ بنایا اور اثبات ذات کے سفر میں فرد کا ساتھ دیا۔

د۔ سید ماجد شاہ کا تعارف

اردو زبان و ادب کے نثری سرمایہ میں فن افسانہ نگاری کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز سے ہوئی تب سے لے کر اب تک بے شمار افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقی جوہر سے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ ۱۹۳۵ میں ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے کو ایک نیا رنگ اور آہنگ عطا کیا اور اسے مقصدیت سے آشنا کرایا۔ امتداد زمانہ جہاں دیگر اصناف ادب میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ وہاں اردو افسانہ بھی اپنی ہیت اور موضوع کے اعتبار سے کئی مراحل سے گزرا۔

افسانہ اپنے عہد میں پیدا ہونے والے نئے رجحانات اور تبدیلیوں کو جامعات اور وحدت تاثر کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس عہد کا مصنف معاشرے کا نباض اور عکاس ہوتا ہے۔ اگر ہم دور حاضر اور جدید افسانہ نگاروں کی بات کریں تو جدید افسانہ نگاروں میں سید ماجد شاہ کا نام سرفہرست ہے۔ جنہوں نے علامتی پیرایہ میں اردو افسانے کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں کے اصطلاحی موضوعات اور رومانویت، تاریخی و اساطیری فکر عائلی رشتوں سے محبت، ماضی پرستی، جنسی ناہمواریوں کی کڑواہٹ اور نفسیاتی حربے معاشرے کی سچی کہانیوں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس پر علامت اور تجرید کا خوبصورت تجربہ تحریر کو جاذب اور دلکش بناتا ہے۔ قاری کے لیے نئے سوالات جنم لیتے ہیں۔ سید ماجد شاہ کے

ہاں موضوعات کا تنوع ہے اور اسے برتنے کا ایک الگ ہی معیار ہے۔ سید ماجد شاہ کی ذاتی اور ادبی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

حالات زندگی

سید ماجد شاہ کے آباواجداد صوابی سے ہجرت کر کے ایبٹ آباد (میاں دی سری) میں آباد ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب امام موسی کاظم سے جاملتا ہے۔ آپ کے دادا بلند پایا بزرگ تھے۔ سلسلہ چشتیہ سے تعلق تھا۔ آپ کا مزار ایبٹ آباد میں ہے۔ سید ماجد شاہ کے والد سید محمد شاہ کاظمی نے پیری فقیری چھوڑ کر ایئر فورس میں ملازمت اختیار کر لی۔ تاہم پیر گھر آنے کا سلسلہ ابھی بھی موجود ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر بشیر احمد سوز کتاب میں رقمطراز ہیں:

> "ماجد شاہ کا تعلق ایک پیر گھرانے سے ہے گاؤں میاں دی سری ایبٹ آباد میں برلب شاہراہ ریشم ان کے دادا کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ ان کے والد نے روایتی پیری فقیری ترک کر کے ملازمت کا پیشہ اختیار کیا"۔ (۲۰)

سید ماجد شاہ کے والدہ خدیجہ بانو کا تعلق ٹیکسلا کے کاظمی سادات گھرانے سے ہے۔ آپ کے نانا بھی اپنے آباء کی گدی سنبھالے ہوئے تھے۔ ماجد شاہ کے بھائی وکالت کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ آپ کی تین بہنیں ہیں دو آپ سے بڑی جبکہ ایک چھوٹی ہے۔

سید ماجد شاہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ کو چکلالہ راولپنڈی میں پیدا ہوئے لیکن سکول اور دیگر ریکارڈ میں آپ کی تاریخ پیدائش ۱۳ اپریل ۱۹۶۶ ہے جو درست نہیں ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مردان اور سالپور سے حاصل کی پھر والد کے ہمراہ کراچی منتقل ہو گئے۔ تیسری اور چوتھی جماعت وہاں سے پاس کی پھر ایبٹ آباد آ گئے۔ میاں دی سری (ایبٹ آباد) سے پاس کی ششم تا دہم تک تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۲ ایبٹ آباد سے حاصل کی بی کام کامرس کالج منڈیاں (ایبٹ آباد) کامرس کالج مانسہرہ سے کیا۔ ۱۹۹۵ میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ ایم اے (اردو) کی ڈگری حاصل کی۔ سید ماجد شاہ مطالعہ کے شوقین ہیں کتاب بینی کا شوق ان کی فطرت میں شروع سے ہی رچا بسا ہوا تھا۔ شاعری اور افسانے کی طرف رجحان رہا پسندیدہ شعراء

میں مرزا غالب اور جون ایلیا جب کہ نظم کے شعراء میں ن م راشد، مجید امجد اور فیض احمد فیض شامل ہیں۔ افسانے میں ڈاکٹر انور سجاد، انتظار حسین اور منٹو سے متاثر ہیں۔

کھیلوں میں کرکٹ پسند ہے اس کے علاوہ بچپن سے وقت گزاری کے لیے گلی ڈنڈا، کنچے کھیلنا اور مرغیاں پالنا جیسے مشاغل بھی رہے۔ فلم بینی کا شوق رہا۔ جس کے لیے گھر سے چھپ کر سینما میں فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ سیر و سیاحت کے دلدادہ ہیں اپنے خاص دوستوں کے ساتھ اکثر لمبے سفر پر نکل جاتے ہیں۔ فطرت کے قریب رہنے میں سکون محسوس کرتے ہیں تاریخی مقامات میں دلچسپی رکھتے ہیں مری، ناران کاغان پسندیدہ مقامات ہیں اس کے علاوہ لیبیا، بیروت، لبنان اور سعودی عرب کے سفر بھی کیے۔ دو بار عمرے کی سعادت بھی حاصل کی۔ تعلیم کے بعد ۱۹۹۴ میں سید ماجد شاہ ماڈل کالج اسلام آباد میں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں ۱۹۹۷ میں پنجاب گروپ آف کالجز سے منسلک ہوئے۔ ۲۰۱۳ سے پیغام کالج آف سائنس اینڈ کامرس میں معلم کی حیثیت سے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے قریبی دوستوں میں عامر سہیل، ڈاکٹر عاکف اللہ، حمید اللہ جدون، احمد سلمان اور سرمد سروش شامل ہیں۔

سید ماجد شاہ ۱۹۹۳ میں رشتہ ازواج میں منسلک ہوئے آپ کی اہلیہ مفیدہ ماجد بھی ادبی ذوق رکھتی ہیں۔ شادی کے بعد ماجد شاہ کی رفاقت نے اس ذوق کو مزید ہوا دی۔ آپ بہترین افسانہ نگار اور مترجم ہیں۔

> "مفیدہ ماجد یکم اپریل ۱۹۷۶ کو ایبٹ آباد میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد سید فاروق شاہ سجادہ نشین ہیں۔ ادبی ذوق بچپن سے تھا لیکن آپ کے ادبی ذوق کو جلا شادی کے بعد ملی۔ ان کی شادی ۱۹۹۳ میں ماجد شاہ صاحب سے ہوئی"۔ (۲۱)

سید ماجد شاہ کی اکلوتی اولاد ژند ماجد ہیں جو کہ بی ایس اورلاء کے طالب علم ہیں۔

ادبی زندگی

یوں تو سید ماجد شاہ کو زمانہ طالب علمی سے ہی غیر نصابی کتب کے مطالعے کا شوق رہا۔ شاعری کی طرف بھی رجحان رہا۔ لیکن خود لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ آپ کے باقاعدہ ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ آپ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار ہیں اردو اور ہندکو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ آپ کی کتابیں جو شائع ہو چکیں یا زیر طبع ہیں ان کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

"ق" (اردو افسانے) ۲۰۱۶

"ر"(اردو مختصر افسانے)۲۰۱۸

"م"(اردو شاعری۔۔۔غزلیں / نظمیں)زیر طبع

"در شاہی"(ہندکو نظم نثر)۲۰۱۷

"اورش"(ہندکو افسانے)۲۰۱۷

"بلد ادیوا"(ہندکو ناول)۲۰۲۰

"کہانڑیں آخدی اے"(ہندکو مختصر افسانے)زیر طبع

"سر بن دی چھنگ"(ہندکو نثری نظمیں)زیر طبع

منتخب ہندکو کا اردو ترجمہ اکادمی ادبیات پاکستان کے تعاون سے زیر طبع ہے۔اس کے علاوہ کے ٹوٹی وی پر ہندکو کتابوں پر "ہک کتاب ہزار دی" تبصرہ بھی شامل ہے۔بہترین ادبی خدمات پر ادبی حلقوں سے چند اعزازت بھی ملے:

"ق" پر پروفیسر محمد شفیع ایوارڈ، اباسین آرٹس کونسل، پشاور میں ۲۰۱۵ کو ملا۔

اورش، دل دریا پاکستان کا پہلا ایوارڈ ۲۰۱۸ میں وصول کیا۔

نیشنل ٹیلنٹ ایوارڈ ۲۰۱۸ میں نیشنل ٹیلنٹ کونسل ایبٹ آباد سے حاصل کیا۔

رضا ہمدانی ایوارڈ ہندکو ناول "بلد ادیوا" جبکہ اسی ناول کو ۲۰۲۱ میں دریادل پاکستان ایوارڈ سے بھی نوازا۔

سید ماجد شاہ کا ادبی سفر جاری و ساری ہے۔کسی بھی لکھاری کی پہچان اس کا مخصوص اسلوب اور وہ مصنف کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ذیل میں ہم سید ماجد شاہ کے افسانوں کے فکر و فن کے حوالے سے مختصر گفتگو کریں گے۔

سید ماجد شاہ کے افسانوں کا فنی جائزہ

سید ماجد شاہ کے افسانوں میں ایسی فنی خوبیاں موجود ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا خاص کر محاکات نگاری، منظر کشی کردار نگاری، تجریدی اور علامتی انداز ان کو امتیازی حیثیت دیتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کی تکنیک کے حوالے سے اپنے افسانوی مجموعہ "ق" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> " میرے نزدیک افسانے کا آغاز اس کا انجام، اس کی زبان، اس کا اختصار، جامعت اور علامتی اظہار وہ خوبیاں ہیں جو اسے فکشن کی دیگر اصناف سے الگ کرتی ہیں اس کے جملے غزل کے مصروں کی طرح

جاندار اور گھنے ہوں۔ روانی، جاشنی اور نشریت کے ساتھ اپنے اندر جہاں
معنی رکھتے ہوں کہ جملہ سن کر بے ساختہ "واہ" نکلے "۔ (۲۲)

سید ماجد شاہ کے افسانوں کے چند فکری پہلوؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

پلاٹ

کسی افسانے کا مرکزی نقطہ اس کا پلاٹ ہے یہ پلاٹ کا ہی کمال ہوتا ہے کہ ایک افسانہ اپنے تمام لوازمات پورا پورا اترتا ہے۔ اگر پلاٹ میں تضاد ہو تو قاری کو حالات وواقعات سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں یہ خلا نہیں پایا جاتا۔ آپ کی علامت نگاری اور بیانیہ بنا کسی ابہام کے قاری تک پہنچتا ہے۔ جسے افسانہ "میں ہوں تو میرا سایہ ہے" علامتی طور پر باطن کا اظہار ہے جبکہ افسانہ "صابن" میں "صابن" بطور جسم کے علامت ہے۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں کے پلاٹ کا اہم عنصر افسانے کا کلائمکس ہے اختتامی جملہ قاری کو نئے سوالات دے جاتا ہے۔

کردار نگاری

سید ماجد شاہ کے افسانوں کے کردار حقیقی زندگی سے عبارت ہیں آپ نے روزمرہ زندگی کے مسائل کو علامتی انداز میں پیش کیا آپ کے افسانوں میں کردار معاشرے کے عام انسان ہیں۔ جن کو مصنف نے باریک بینی سے نفسیاتی مشاہدے کے ساتھ پیش کیا ان کے نزدیک ہر کردار اور ہر انسان دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک "کوک بھرا" کھلونا ہے۔ تقدیر کا جبر، ماحول، معاشرے کا جبر، نفسیات کا جبر جب ہم سب کو کوک بھریں ہیں۔ تو کوئی کردار برا کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے اپنے کرداروں کی اصلاح مقصود نہیں نہ ہی ان کہانیوں کا مقصد معاشرے کی اصلاح ہے اور نہ ہی ثناء خواں تقدس مشرق کو غیرت دلانے مقصود ہے مجھے ہر کردار واقعی اور مکمل دکھائی دیتا ہے۔

مصنف کے نزدیک کہانی اور کردار کی تلاش ایک مشکل کام ہے اور پھر اس کو ہو بہو حقیقی رنگ میں پیش کرنا بھی ایک سفاک اذیت ہے۔ افسانہ "جلا کر راکھ کر دینے والی ٹھنڈک"، "صابن"، اتفاق محض اتفاق، آئی ایم سوری ژندی جان کے کردار اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

منظر نگاری

سید ماجد شاہ کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات میں ایک خصوصیت ان کی منظر نگاری ہے وہ الفاظ کی مدد سے ایسی مصوری کرتے ہیں کہ سارا منظر آنکھوں دیکھا محسوس ہوتا ہے۔ تصویر کو لفظوں میں پیش کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ ایک تو تحریر رواں ہو جاتی ہے دوسرا گنے چنے الفاظ میں قاری منظر کو اپنے سامنے محسوس کرتا ہے۔ یہی ان کی منظر نگاری اور محاکات نگاری میں ہم آہنگی کا سبب ہے۔

محاکات نگاری (امیجری)

کسی بھی تصور کو زبان دینا محاکات نگاری ہے یہ خواہ رنگوں سے ہو، الفاظ سے، اشارے سے یا علامتی انداز سے، شاعر و ادیب الفاظ کے ذریعے وہ تصور پیش کرتے جن کا خارجی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہوتا یہ انسانی تجربے کی ترسیل میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ محاکات شاعری میں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں لیکن نثری اصناف میں اس کا استعمال جس قدر مشکل ہے اس قدر تحریر کی دلکشی کا باعث بھی ہے۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں محاکات کو خوبصورت علامتی انداز میں بیان کیا جاتا ہے جو کہ حسی تجربات کو مزید حسن بخشتا ہے۔

خاکہ نگاری، مقالمہ نگاری

کسی بھی کردار کو بیان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خاکہ نگاری پر دسترس ہو کردار کا سراپا پیش کرنا ایک فن ہے جو اس کی ہو بہو تصویر پیش کرتا ہے۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں کی خاکہ نگاری اس قدر واضح ہوتی ہے کہ کردار حقیقی اور جان دار لگتے ہیں۔ پھر کردار کے مکالمے ایک حربے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ سید ماجد شاہ کے مکالموں کی زبان سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔ کردار جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے مکالمے بھی اسی لہجے اور زبان سے ہوتے ہیں جو کہ افسانے کو مزید نکھار دیتے ہیں۔

شعری اصطلاحات کا استعمال

سید ماجد شاہ کے اسلوب کے سب سے دلکش خوبی شعری زبان کا استعمال ہے جو کہ نثر زیادہ چاشنی عطا کرتا ہے۔ وہ شاعری بھی ہیں۔ تو صنائع لفظی اور صنائع معنی کے استعمال سے تحریر کو مزید سنوار دیتے ہیں۔ خوب استعارے، تشبیہات اور شعری اصطلاحات کا نثر میں استعمال کر کے کلام میں معنی خیزی اور لطافت پیدا کرنا جانتے ہیں۔

سید ماجد شاہ کے افسانوں کا فکری جائزہ

سید ماجد شاہ کے افسانوں کا فکری جائزہ سید ماجد شاہ نے ایک ماہر نفسیات کی طرح معاشرے کے نفسیاتی مسائل پر ہاتھ رکھا اور بڑی جرات اور بہادری سے انہیں اپنی تحریروں میں سمویا۔ فکری لحاظ سے وہ زندگی اور فطرت کے قریب رہے ان کے فطرت شناس، رجحان، گہرے مشاہدے، زندگی، جنس، حالات حاضرہ، ماضی پرستی، نفسیاتی مسائل، استحصال اور معاشرتی طبقاتی کشمکش پر گہری نظر اور گرفت نظر آتی ہے اور انہوں نے انہی موضوعات کو اپنی تحریروں میں خوش اسلوبی سے برتا۔ ان موضوعات کے حوالے سے ڈاکٹر نو میلا وسیلو کتاب "ق" کے پس ورک میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں

> "حسرت ہے کہ پاکستان میں اب بھی اس شجر ممنوعہ پر لکھنے والے موجود ہیں جس پر مغرب میں بھی کم کم ادیب ہاتھ ڈالتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ کو ان موضوعات میں کرختگی محسوس ہو اور ان کی انانیت پر بھی ضرب لگے کیونکہ یہ افسانے جس سماج کی عکس بندی کرتے ہیں وہاں روایات اور اقدار کی بڑی پاسداری کی جاتی ہے"۔ (۲۳)

سید ماجد شاہ کے افسانوں کے چند فکری محاسن:

شعور زندگی

سید ماجد شاہ کے افسانوں میں زندگی کے سبھی رنگ ملتے ہیں جن میں فطرت کا حسن، زندگی کی بد صورتیاں اور ان کا انسانی زندگی سے ربط موجود ہے کیونکہ وہ زندگی کی تلخیوں کو فطرت سے ہم آہنگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ فطرت کے گہرے مشاہدے کو تمثیلی اور علامتی انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ افسانہ "ژندی جان"، "صابن" اور "گھوم رہے سورج" اس کی بہترین مثالیں ہیں

طبقاتی کشمکش اور استحصال

سید ماجد شاہ کے افسانوں میں طبقاتی کشمکش اور استحصال کی مختلف صورتوں کو بڑی مہارت سے پیش کیا گیا۔ جن میں معاشی، سماجی، سیاسی، مذہبی و طبقاتی کشمکش اور استحصال کو موضوع بنایا گیا۔ معاشی و سماجی مسائل، بھوک، غربت، اخلاقی بے راہ روی اور ان سے پیدا شدہ نفسیاتی مسائل کو موضوع بنایا گیا۔

زندگی کی بے ثباتی اور بے مقصدیت (لایعنیت)

سید ماجد شاہ کے افسانوں میں جہاں ایک طرف زندگی کی اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ فطرت کے حسن سے شناسائی ملتی ہے ،وہیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا جارہا ہے کہ یہ زندگی کرب و اذیت سے لبریز ہے۔ زندگی کی لایعنیت اور بے مقصدیت نے اسے صرف بدصورت ہی نہیں بنایا بلکہ یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ جس کے لیے فرد کو تگ و دو کرنی ہو گی اور اپنے اندر اٹھنے والے سوالات کے جوابات تلاش کرنے ہوں گے لایعنیت اور وجودی فکر سید ماجد شاہ کے افسانوں میں بدرجہ اتم ملتی ہے۔

جنسی موضوعات

ہمارے ہاں جنسی موضوعات کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم ان موضوعات کو پڑھنا تو چاہتے ہیں مگر ان کے متعلق بات کرنے سے گھبراتے ہیں اور بے جا تنقید اور اخلاقی قباحت سمجھ کر مذہبی ہونے کا ڈھونگ بھی رچایاتے ہیں۔ جنسی آسودگی قانون فطرت ہے جو زندگی کے تسلسل کے لئے لازم و ملزوم ہے جس کے لیے مذہب اور فلسفہ اخلاق میں ضابطے موجود ہیں تاکہ معاشرہ بے راہ روی کا شکار نہ ہو۔ ہمارے ہاں جب بھی کسی ادیب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اسے بے تحاشہ تنقید اور فحش نگاری کے الزامات کے تحت مقدمات بھگتنے پڑے۔ جس کی بڑی مثال منٹو ہے۔ سید ماجد شاہ نے ان موضوعات کو نہایت نزاکت سے برتا ہے ان کے نزدیک ادب تنقید حیات ہیں اور ان موضوعات کو ادب کا حصہ بنانا لازم ہے۔ آپ نے نہایت بے باکی سے معاشرے کے غلیظ عناصر کو بے نقاب کیا۔ افسانہ "پیوند"، "انتہائی گھٹیا آدمی" اور "مکروہ" جنسی موضوعات پر لکھے گئے افسانے ہیں۔

ماضی پرستی

ماضی پرستی ایک رومانوی رویہ ہے ہر فرد کا اس کی طرف قدرتی رجحان ہے جب وہ زندگی کی تلخیوں اور مشکلات سے گھبرا جاتا ہے تو ماضی کی دلکش یادوں میں پناہ لیتا ہے۔ اور یہ رابطہ انسان کو ناساعد حالات میں زندگی کی کٹھن سے پرے کسی خوشگوار ماحول میں لے جاتا ہے۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں ماضی پرستی کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

وطن سے محبت

اپنی دھرتی اور وطن سے محبت ہر شخص کو ورثے میں ملتی ہے۔ خاص طور پر جہاں انسان پیدا ہوا ہو اور بچپن گزارا ہو اس علاقے سے محبت گھٹی میں شامل ہوتی ہے۔ سید ماجد شاہ کا تعلق ایبٹ آباد کی خوبصورت

وادی سے ہے جہاں قدرتی حسن کی سحر انگیزی کسی کو بھی اپنی گرفت میں لے سکتی ہے۔ آپ کے افسانوں کی منظر نگاری بے اختیار قاری کو ان حسین وادیوں کے مناظر میں پہنچا دیتی ہے جو کہ سید ماجد شاہ کا اپنی دھرتی سے دلی محبت کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ ملکی حالات اور مسائل پر بے شمار افسانے ملتے ہیں جو کہ محب وطن شہری ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔

تصور آزادی، انفرادیت (موضوعیت)

سید ماجد شاہ کے افسانے فرد کی شناخت آزادی اس کی انفرادی زندگی کے عکاس ہیں۔ آپ کے افسانے فرد کی موضوعی زندگی کے حوالے سے بے شمار موضوعات ملتے ہیں فرد اگر زندگی کی لایعنیت اور بے مقصدیت سے بیزار ہے تو وہ ہر گز موت یا خودکشی کی خواہش نہیں رکھتا بلکہ وہ نئے امکانات سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی آزادی کے لئے نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ اپنے من میں اٹھنے والے سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے سید ماجد شاہ نے خاص کر موجودہ مشینی دور سے پیدا شدہ اضطرابی کیفیات اور ان مسائل پر کئی نئے سوالات اٹھائے کہ موجودہ فرد کن وجودی مسائل کا شکار ہے اور اس کی داخلی زندگی کس طرح اس کے خارجی معاملات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ افسانہ نگار نے فرد کی موضوعی زندگی کے حوالے سے بے شمار مضامین کو نئی فکر اور تکنک کے ساتھ برتا۔ یہ تمام فکری و فنی محاسن سید ماجد شاہ کو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ممتاز بناتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ احمد دہلوی، سید (مولف) فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم، مکتبہ حسن سہیل، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۶۴۲

۲۔ سلطان علی شیدا، وجودیت پر ایک تنقیدی نظر، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۷۸، ص ۱۶

۳۔ حیات عامر حسینی، وجودیت، بتول پبلی کیشنز، سرینگر، ۱۹۹۱، ص ۳۰

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، ایجوکیشنل، پبلشرز، دہلی، ۱۹۸۹، ص ۳۱۷۔۳۱۶

۵۔ باری، انقلاب فرانس، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۰، ص ۸۸۔۸۷

۶۔ فضل اللہ بخاری، سید، جنگ عظیم اول، دارالشعور، لاہور، ۲۰۱۰، ص ۳۷۲

۷۔ محمد اسد، طوفان سے ساحل تک، آمین آباد، لکھنؤ، ۱۹۱۶، ص ۱۰

۸۔ خالد محبوب (مرتب)، ژاں پال سارتر ادب، فلسفہ وجودیت، نگارشات. پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۴۰۱

۹۔ محمد اسد، طوفان سے ساحل تک، ص ۱۰

۱۰۔ خالد محبوب (مرتب)، ژاں پال سارتر ادب، فلسفہ وجودیت، ص ۴۰۱

۱۱۔ احسان اشرف، پروفیسر، وجودیت کا فلسفہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو، پٹنہ، ۲۰۱۰، ص ۳۲

۱۲۔ افتخار بیگ، ڈاکٹر، وجودیت اور اردو شعری طرز اظہار، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶، ص ۵۳

۱۳۔ خالد محبوب (مرتب)، ژاں پال سارتر ادب، فلسفہ وجودیت، ص ۱۰

۱۴۔ یاسر جواد، ایک سو عظیم فلسفی، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۲، ص ۳۸۵

۱۵۔ روزنامہ، نوائے وقت، ملتان، ۱۴ اگست ۱۹۹۴

۱۶۔ قاضی جاوید، پاکستان کے فلسفیانہ رجحانات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳، ص ۹۷

۱۷۔ وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، خواجہ پریس، دہلی، ۱۹۶۹، ص ۱۹

۱۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، ایک صدی کے افسانے، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۰، اص ۱۰۳

۱۹۔ وحید اختر، ڈاکٹر، فلسفہ اور ادبی تنقید، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۲، ص ۱۷۴

۲۰۔ بشیر احمد سوز، پروفیسر، ہزارہ میں اردو افسانے کی روایت، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، ۲۰۱۰، ص ۱۷۱

۲۱۔ بشیر احمد سوز، پروفیسر، ہزارہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ، ادبیات، ہزارہ، ۲۰۱۰، ص ۱۷۱

۲۲۔ ماجد شاہ، سید، ق، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶، ص ۱۱

۲۳۔ ایضاً، سرورق

باب دوم:

سید ماجد شاہ کے افسانوں میں لایعنیت

وجودیت ایک وسیع النظر فلسفہ ہے۔ جس نے تمام باشعور افراد کو اپنے حصار میں لیا ہوا ہے۔ تمام اہل فکر کہیں نہ کہیں اس سے متاثر نظر آتے ہیں ایسے میں چند وجودی عناصر جن پر فلسفہ وجودیت کی بنیاد ہے ان کا ذکر لازمی ہے۔ جو کہ لایعنیت، تصور آزادی اور فرد کی انفرادیت اہم ہیں یہ زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک کا ہونا دوسرے کے وجود کی دلیل ہے۔ سب سے پہلے لایعنیت کے پہلو پر ایک نظر ڈالیں گے۔

الف: لایعنیت کا وجودی پس منظر

وجودیت اضطرابی کیفیات میں زندگی کے لیے امکانات سے لڑنے اور بغاوت کرنے کا نام ہے۔ کیوں کہ فرد تادیر کسی جامد اور طے شدہ نظام کا حصہ نہیں رہ سکتا وہ اپنے وجود کی پہچان اور انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے ایک مسلسل کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ اس سفر میں فرد کی داخلی اور جذبی کیفیات اسے عرفان ذات میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ انہیں کیفیات میں سے ایک کیفیت لایعنیت کہلاتی ہے۔

لایعنیت ہمیں دو وجودی موضوعات داخلی واردا تیں اور لغویت میں ملتی ہے۔ لیکن دونوں جگہ اس کا اثر اور کام مختلف ہے۔ داخلی واردات میں وجود لایعنی کیفیت فرد کو وقتی کرب سے نکلنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ وہ لایعنی کیفیت میں اپنے سوالات، ناکامیوں اور صدمات سے نبرد آزما ہو کر اپنی انفرادیت کو جانتے ہوئے اپنی آزادی اور خود مختاری کی راہ کو آسان کرتا ہے۔ جبکہ لغویت میں جنم لینے والی لایعنیت ایک مسلسل کیفیت ہے جو کہ شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جو فرد کو آخر موت کے خوف یا خودکشی جیسی مایوس کن فکر کے حوالے کر جاتی ہے۔ لایعنیت کا پس منظر جاننے سے قبل اس کے معنی و مفہوم کے متعلق جاننا بھی لازم ہے۔

لایعنیت کے لیے انگریزی لفظ (Absurdism) استعمال ہوتا ہے جس کے معنی اصطلاح میں وجود کی معنویت و اہمیت کے ختم ہونے کا احساس ہے۔ یعنی فرد کو اپنی زندگی بے رنگ اور مقصدیت سے عاری

معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کا بے کیفیت ہو جانا، بے معنی ہو جانا ہی لایعنیت ہے۔ قاضی جاوید اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "انسان دائمی طور پر لغو حالتوں میں زندگی پر جبر کرتا ہے اور ان پر قابو پانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ مگر اس کی تمام سرگرمیاں لاحاصل اور لایعنی ہیں۔"[1]

زندگی کی محدودیت سے عاجز فرد لایعنیت کا شکار ہے۔ کبھی زمانے کی محدودیت، کبھی مکانات کی، کبھی آزادی کی، کبھی انتخاب کی اور آخر کار موت کی محدودیت فرد کو بھی مقصدیت کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

فرد میں احساسات اور جذبات دوہری کیفیات کے حامل ہوتے ہیں۔ جن میں ایک موضوعی اور دوسری معروضی شکل میں شامل ہے۔ یہ احساسات مادی دنیا سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور جذبوں سے بھی جڑے رہتے ہیں۔ یہی احساسات فرد کو بیرونی دنیا سے جوڑے رکھتے ہیں۔ ورنہ فرد ایک علیحدہ وجود ہے اور دنیا ایک الگ شے جسم اور جذبہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں کی جڑت ہی فرد کے اندر حسوں کو بیدار کرتی ہے۔ وجودی فلاسفر جذبی کیفیات اور ان کے جسم سے تعلق کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور انہیں داخلی وارداتوں کا نام دیتے ہیں۔ یہ وارداتیں قنوطی اور رجائی دونوں طرح کی ہو سکتی ہیں، جیسے خوف، دہشت، کرب، تشویش، لایعنیت، اکتاہٹ، مایوسی، خوشی، مسرت اور امید یہ کیفیات نفسیاتی نہیں ہوتیں اس لیے انہیں عقل کے پیمانوں پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ یہ براہ راست ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں جیسے سب کا آغاز کرب سے ہوتا ہے۔ فرد اثبات ذات کے سفر میں کرب سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ ایک وجودیاتی مظہر ہے۔ پھر فیصلہ کرنے میں ناکام ہونا، الجھنیں، راستے کی مشکلات اور انجام کے خوف میں مبتلا فرد امکانات کے سفر سے گریز کرتا ہے۔ یہی کرب لایعنیت، انفرادیت اور تصور آزادی سے مشروط ہے۔ لایعنیت کی یہ کیفیت فرد کے برے دنوں اور حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ یا کسی مخصوص کیفیت کے تحت طاری ہوتی ہے۔ اس داخلی کیفیت سے نکلنا قدرے آسان ہے کیونکہ یہ وقتی ہوتی ہے۔ ذرا سی کوشش سے نئی امکانات کا سفر ممکن ہے۔ جو کہ فرد کو لایعنی کیفیت سے چھٹکارہ دلا سکتا ہے۔

مگر فرد پر ایک کیفیت ایسی بھی طاری ہوتی ہے کہ اس کے لیے دنیا لغو اور بے مقصد ہو جاتی ہے۔ یہاں کوئی شے حتمی نہیں حتی کہ انسان بھی کسی اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ یہ فلسفہ فرد کو خودکشی اور موت کی

طرف دھکیل دیتا ہے۔ انسان تمام زندگی بے مقصدیت اور لایعنیت کے زیر سایہ گزار دیتا ہے۔ یہ نقطہ نظر ہمیں وجودی مفکر نطشے کے تصور عدمیت سے پھولتا پھیلتا نظر آتا ہے۔ جو بعد ازاں ژاں پال سارتر اور کامیو کے نظریات میں لغویت کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ انسان ایک بے معنی کائنات میں بلا جواز پھینک دیا گیا ہے۔ جو کہ ایک کرب اور اضطراب کی کیفیت میں جی رہا ہے۔ وجودی مفکرین کی ذاتی زندگیاں بھی ایسی ہی حالت میں بسر ہوئی کہ وہ تمام عمر تنہائی اور لایعنی پن کا شکار رہے۔ لغویت کے سائے میں پیدا ہونے والی لایعنی کیفیت انسانی زندگی کو کوئی مثبت رہنمائی فراہم نہیں کرتی۔ نہ ہی انسانی و اخلاقی اقدار کی کوئی ضمانت ملتی ہے۔ دنیا کا بے مقصد اور لغو ہونا فرد کو خودکشی کی طرف راغب کرتا ہے۔ لایعنیت کی دونوں ہی صورتیں چاہے وہ سارتر کی جامد اور لایعنی زندگی ہے یا کامیو کی مسلسل لاحاصل جدوجہد سے عبارت زندگی دونوں ہی فرد کے اثبات ذات اور اس کی استواریت کے لیے لازم ہیں۔

ب:۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں لایعنیت

سید ماجد علی شاہ کے افسانے زندگی کی تلخیوں سے کشید کیے گئے ہیں۔ جن میں نہ صرف ان کی تخلیقی قوت اور آنکھوں دیکھے واقعات شامل ہیں بلکہ ان کی ذاتی زندگی تجربات و مشاہدات کا عمل دخل بھی ہے۔ بعض دفعہ ان کے تخلیق کردہ کردار ذہن میں کئی سوال لے کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

جن کا براہ راست تعلق انسان کی داخلی زندگی سے ہوتا ہے۔ جہاں بھی فرد کی داخلی زندگی کی گفتگو ہو وہاں داخلی وارداتوں کا ہونا لازم ہے۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں جابجا زندگی کا لایعنی پن اور بے مقصدیت نظر آتی ہے۔ کرب، دہشت اور اکتاہٹ کی کیفیت پائی جاتی ہیں۔ افسانوی کردار کربِ مسلسل سے گزرتے ہیں۔ نت نئے امکانات سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور اپنے لیے نئی راہیں متعین کرتے ہیں۔ اس دور میں پیدا ہوئی لایعنی کیفیات فرد کو شعور و آگہی سے نوازتی ہیں۔ بعض کردار دائمی لایعنیت کا شکار نظر آتے ہیں جو زندگی کی بے مقصدیت اور مہملتا سے اس قدر تنگ ہیں کہ موت کی خواہش کرتے نظر آتے ہیں۔ سید ماجد شاہ خود بھی وجودی فکر کے حامل افسانہ نگار ہیں جس کا ذکر وہ خود اپنی کتاب "ق" میں کرتے ہیں۔

> "تخیل نے میرے لیے دو دنیائیں بنا رکھی ہیں ایک وہ جس میں، میں چھ ارب لوگوں کے ساتھ تنہا رہتا ہوں۔ یہ دنیا میرے لیے تلخ، بد مزہ، لایعنیت سے لبریز اور چھلکتی بے مقصدیت لیے ہوئے ہے۔"(۲)

جس نفسا نفسی اور مشینی دور میں آج کا فرد سانس لے رہا ہے افسانہ نگار بھی اسی اضطرابی دور کا حصہ ہے۔ اس لیے وہ بھی اس خارجی زندگی کی پیدا کردہ بدمزگیوں سے متاثر ہوتا ہے۔ اجتماعی لایعنیت اور بے مقصدیت کا شکار اس معاشرے میں فرد کی انفرادیت خطرے میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید ماجد شاہ نے سیاسی و سماجی ادب استحکام، جبریت، معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں سے پیدا شدہ مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جس میں لایعنیت کا پہلو نمایاں ہے۔

افسانہ "آنکھ کے اندھے"

سید ماجد شاہ کا افسانہ "آنکھ کے اندھے" ان کے افسانوی مجموعے "ق" میں شامل ہے۔ افسانے کی کہانی خوب صورت وادی میں بسنے والے ایک نوجوان تنویر کے گرد گھومتی ہے جو کہ اپنے ذہن میں اٹھنے والے عجیب و غریب سوالات سے پریشان ہوتا ہے۔ وہ اپنے شعور اور لاشعور کے درمیان محو سفر ہے۔ انجانے خوف اور کرب نے اس کے حواس پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ سورج کی موت واقع ہو چکی ہے دنیا مکمل اندھیرے میں ڈوب چکی ہے چاند پتھر ہو چکا ہے۔ وہ خود اس خوف اور وہم سے نکلنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ مگر ہر طرف پھیلا اندھیرا اسے مایوسی اور لایعنیت کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ ایسے میں اس کی محبوبہ اور بیوی رخسانہ اسے امید دلاتی ہے کہ وہ ایسی باتیں نہ سوچے اور نہ ہی دوسروں سے اس کا تذکرہ کرے۔ افسانے کے وسط میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعی کئی دن تک سورج طلوع نہیں ہوتا لوگ مشرق کی طرف دیکھتے دیکھتے تھک جاتے ہیں۔ لوگ برے اعمال کو اس اندھیرے کی وجہ بتاتے ہوئے ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں۔ وہ خدا کی ناراضگی کی بات کرتے ہیں اور اسے منانے کے لیے مقدس سفر کی ٹھان لیتے ہیں۔ وہ اس دیس جانے کی بات کرتے ہیں جہاں سورج چمکتا ہو۔ تنویر ایک جذباتی تقریر کر کے انہیں سمجھاتا ہے کہ وہ ہجرت کی حماقت نہ کریں مگر وہ اس کی بات نہیں سنتے۔ وہ وادی سے جدائی کے غم میں نڈھال سفر کی تیاری کرتا ہے۔ سفر کے دن بھی سمت کے یقین میں جھگڑا ہوا کئی قتل ہوئے اور آخر کار سب طاقت ور کے ساتھ چل پڑے۔ یہ طویل سفر کئی ہزار میلوں پر محیط تھا لوگ گناہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ تنویر کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوتی ہے۔ جس کو اندھیرے میں دیکھنے کی خواہش میں تنویر یہ انکشاف کرتا ہے کہ اس کی پوروں پر آنکھیں اگ آئی ہیں۔ رخسانہ خوف کے مارے اسے چپ کرا دیتی ہے۔ قافلہ ایک زمانہ چلتا ہے تنویر بوڑھا ہو چکا ہے وہ مرنے سے قبل قافلے والوں کو سمجھاتا ہے کہ بستی آباد کرو ورنہ تمہاری نسلیں نابینا پیدا ہوں گی۔ مجمع والے تنویر کی

بات سننے کے بعد اسے قتل کر دیتے ہیں۔ قافلہ چلتا رہتا ہے۔ تنویر کی موت والے دن جشن منایا جاتا ہے جو ایک مذہبی تہوار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اصل کہرام تب مچا جب قبیلے میں ایک آنکھ والا بچہ پیدا ہوا جس کے گال اس کے ماتھے سے ملے ہیں۔ حالات بدستور ویسے ہی ہیں ہاں تنویر کے خیالات اس کی بیٹی کے ذریعے آگے منتقل ہو رہے ہیں۔

افسانے کی کہانی علامتی انداز میں بیان کی گئی ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے سماج میں پھیلے اضطراب اور لایعنی کیفیت کا عکس دکھایا ہے۔ تنویر کا اضطراب، اس کا شعور اور زندگی کی بے مقصدیت اس بات کی غماز ہے کہ وہ معاشرے کے لگے بندھے نظاموں سے باغی ہے۔ اس کا شعور نئے سوالات کو جنم دے رہا ہے جسے تنویر مجمع سے خطاب کے دوران کہتا ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "آئندہ نسلیں نابینا ہوں گی کیونکہ ہماری آنکھوں کا استعمال ختم ہو چکا ہے۔ اس نے کہا ہمیں جو کرنا ہے اس اندھیرے میں ہی کرنا ہے۔ اگر چہرے پر آنکھیں بے معنی ہو گئی ہیں تو یقین جانو ہمارے ہاتھوں میں، انگلیوں کے پوروں میں، ہمارے پاؤں میں، ہمارے جسم کے ایک ایک روئیں پر ہزاروں آنکھیں اگ آئیں گی۔"[۳]

فرد کی زندگی اس کی لگن اور حوصلے سے عبارت ہے۔ اس کے جذبوں کی حرارت ہی اسے زندگی سے وابستہ رکھتی ہے۔ اگر وہ اس جذباتی وابستگی کے ہوتے ہوئے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ تو وہ معتبر ہے لیکن وہ ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہے تو زندگی لغو، بے معنی اور لایعنیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ تنویر بھی اسی کیفیت کا شکار ہے وہ بجائے ناامید ہونے کے اور جھگڑنے کے اپنی بستی والوں کو نئے امکانات سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔

مگر بستی اجتماعی لغویت کا شکار ہے۔ وہ محض اسے ایک دوسرے کے برے اعمال کا نتیجہ قرار دے کر اصل حقائق سے چشم پوشی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ محض ایک تنویر کی کہانی نہیں بلکہ سماج کے ہر باشعور فرد کا المیہ ہے۔ جو زندگی کی بے مقصدیت اور لایعنیت کا شکار ہیں۔ افسانہ "آنکھ کے آندھے" سماج کے اضطراب اور کرب کی عکاسی کرتا ہے جو لایعنی فضا کو جنم دیتا ہے۔ افسانہ نگار نے خوبصورتی سے سماج میں رچے بسے کرب اور بے مقصدیت کو افسانے میں پیش کیا ہے۔

افسانے کا رجائی پہلو یہ ہے کہ فرد اس لایعنیت سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ خوف اور ناامیدی سے لڑنے کی نئی راہ متعین کرتا ہے افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"آہستہ آہستہ سب لوگ اندھیرے سے مانوس ہونے لگے گے۔ تنویر نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا یہ مشاہدہ اسے سوچنے کی نئی راہیں دے گیا تھا۔"[۴]

بعض اوقات فرد ہمہ وقت فیصلوں کی لپیٹ میں رہتا ہے اور امکانیت سے برسرپیکار رہ کے اتنا الجھ جاتا ہے یا تو حالات سے ہار مان لیتا ہے۔ یا پھر فراریت کی سوچتا ہے۔ جس طرح قافلے والے تنویر کی بات ماننے کی بجائے بغاوت اور اجتماعی خودکشی کے رستے پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس نصیحت کی طرف دھیان نہیں دیتے جو اسے جینے کا جواز فراہم کر سکتی ہے۔ فلسفہ وجودیت اسی امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ فرد اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے سے سیکھتا ہے۔ کرب میں جینا سیکھتا ہے اور موجودہ لایعنی کیفیت سے نکلنے کی سعی کرتا ہے۔

افسانہ "آپ بیتی / سوانح عمری"

"آپ بیتی / سوانح عمری" سید ماجد شاہ کا مختصر افسانہ ہے جو کہ ان کے افسانوی مجموعے "ق" سے لیا گیا ہے۔ افسانے کی کہانی اس کے عنوان سے ہی ظاہر ہے۔ یہ ایک خود کلامی کی کیفیت ہے۔ ایک ایسے شخص کی کہانی جو اپنی گزری زندگی پر غور و فکر کرتا ہے کہ اس نے کتنا کرب جھیلا، زندگی کے کئی ادوار سے گزرا۔ کتنے ہی امکانات سے نبرد آزما ہوا۔ لیکن عمر کے اس حصے میں آکر وہ یہ سوچتا ہے کہ اس کی عمر بھر کی محنت رائیگاں ہی گئی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں سوچتا ہے کہ وہ کس قدر کمزور تھا کہ اس کے رشتے دار، دوست احباب اسے مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ اس کے دشمن اسے باآسانی شکست دے جاتے تھے۔ وہ اس قدر کمزور شخص تھا کہ آج اپنی گرفت میں بھی نہیں رہا۔ افسانے سے ایک اقتباس جس میں وہ اپنی کیفیت کو کچھ یوں بیان کرتا ہے۔

"وہ ہر بار اپنے ہی ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا تھا۔ جب خود کو پکڑنے کی کوشش میں وہ مایوسی کی حد تک ناکام ہو گیا تو اس نے اپنے بدن سے چکناہٹ محسوس کرنے کے لیے بدن کو چھوا پھر ہاتھوں کو مضبوطی سے

بند کر کے پوری قوت سے چھوڑ دیا اور حیران ہوا کہ نہ جسم چکنانہ گرفت
کمزور اور اس کے باوجود ہر کوشش ناکام ہے؟ وہ خود کو پکڑائی نہیں دے
رہا تھا۔"[۵]

یہاں فرد اپنی ذات کی کم مائیگی کے کرب میں مبتلا ہے۔ کبھی اسے اپنا وجود بہت اہم لگتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے وہ اس کیفیت سے بیزار نظر آتا ہے۔ یہ لایعنی کیفیت اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی ہے۔ ہونے نہ ہونے کا سوال اسے مسلسل عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ افسانہ جدید دور کے ہر فرد کی زندگی کی ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس مشینی دور میں جہاں انسان ترقی کی بھاگ دوڑ میں مصروف ہے اس کے پاس اپنے لیے اور اپنے پیارے رشتے داروں کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔ ایک سا نجھی بے مقصدیت اور افراتفری نے پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہر کوئی زندگی کی یکسانیت سے اکتایا ہوا ہے یہ لایعنیت اس کے لیے کرب کا باعث ہے۔ افسانے کے آخر میں اس لایعنی کرب کو کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

"نہ وہ کسی کی گرفت میں ہے نہ کوئی اس کی گرفت میں ہے اور نہ ہی وہ
خود اپنی گرفت میں ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ کے خلیے چٹ کر گیا۔ وہ
پاگل ہو گیا اور دیوانہ وار سب جھوٹ ہے۔۔۔ سب جھوٹ ہے۔ کہتے
ہوئے کتابیں زمین پر پٹخنے لگا۔"[۶]

آدمی عمر بھر اس قیاس پر گزار دیتا ہے کہ وقت اور سبھی رشتے اس کی گرفت میں ہیں۔ جوانی کی امنگ اور لمس کی آنچ سے وہ اپنے لیے تسکین کے لمحے کشید کرتا ہے۔ لیکن یہ سب عارضی سکون ہے۔ جب شعور اور آگہی دیمک کی طرح اندر ہی اندر انسان کو کھانے لگتی ہے۔ تو تب اسے افسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی دسترس میں نہیں ہے تو دنیا کو اپنی مٹھی میں کیسے کر سکتا ہے۔ افسانہ "آپ بیتی / سوانح عمری" بھی ایسی ہی لایعنی کیفیت کا خوب صورت بیانیہ ہے۔ اگر ہم وجودی فکر کے تناظر میں دیکھیں تو کرکیگارڈ کے ہاں ہمیں جو فرد کی زندگی کے حوالے سے ادوار کی تقسیم ملتی ہے۔ افسانہ اس پر بھی کھرا اترتا ہے۔ پہلا دور لاابالی ہے جو عارضی مسرت اور سکون کا باعث ہے۔ فرد محبت عشق اور جنسی تعلقات کی رنگینیوں سے خوشی کشید کرتا ہوا اخلاقی دور میں داخل ہوتا ہے۔ یہ محدود مرحلہ فرد کو گناہ اور ثواب سے روشناس کراتا ہے اور مذہبی دور میں داخل ہونے کی راہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مصائب کا دور ہے۔ انسان اپنی گزشتہ زندگی کا محاسبہ کرتا ہے۔ زندگی کی لاشئت اور

لایعنیت اس پر قابض ہو جاتی ہے۔ یہی لایعنی کیفیت اسے عرفان ذات سے عرفان الٰہی کی طرف مائل کرتی ہے۔ خدا کی تلاش فرد کا داخلی مسئلہ ہے جو کہ ایک جدلیاتی عمل ہے۔ سید ماجد شاہ کا افسانہ "آپ بیتی / سوانح عمری" بھی اسی جدلیاتی دور سے گزرنے اور خود کو کھوجنے کی ایک سعی ہے۔

افسانہ "کشاف العیوب"

افسانوی مجموعے "ق" میں شامل افسانہ "کشاف العیوب" ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو اپنی ساری عمر موت کے ڈر اور خوف کی کشش کو محسوس کرتے ہوئے گزار دیتی ہے۔ اس کی ذات میں سو عیب ہیں لیکن وہ رشتوں کو نبھانے اور زندگی کے تلخ حقائق کو قبول کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ اسے زندگی کی نزاکتوں سے نبرد آزما ہونا آتا ہے بالکل اس طرح جیسے بچپن میں اسے ایک بار ٹیرس سے گرتے ہوئے بچا لیا گیا تو وہ حیرت انگیز طور پر دوبارہ وہاں سے گزنے کی اداکاری کرنے لگی۔ اسے ذرا خوف محسوس نہ ہوا۔ خوف کی کمی نے اسے اضطراب میں مبتلا کر دیا اور وہ اس سے بھی اونچائی پر جا کھڑی ہوئی۔ اس کی ان حرکات نے اس کے باپ کی شفقت اور محبت کو وحشت میں بدل دیا۔ اور اسے بے تحاشہ مار کھانی پڑی۔ وہ تشدد آج بھی اسے نفسیاتی کرب میں مبتلا کر جاتا ہے۔ وہ موجودہ زندگی میں بھی جان بوجھ کر ایسی حرکات کرتی کہ بات مار پیٹ یا غصے تک آ جائے۔ راوی کی اس خاتون سے دوستی ہو جاتی ہے ان کی دوستی کی بنیاد وہ سب برائیاں بنیں جو دونوں کی ذات تھی۔ یعنی وہ ایک دوسرے کا آئینہ تھے۔ جس میں وہ ایک دوسرے کو واضح دیکھ سکتے تھے۔ افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "خوف کی کمی نے اسے حیرت انگیز طور پر بے چین کر دیا۔ وہ کھیلنا بھول گئی۔ ایک نامانوس بے قراری میں وہ ٹیرس پر ٹہلنے لگی تھی۔ اضطراب بڑھنے لگا تھا۔ جب حد سے تجاوز ہوا تو اچانک اسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا۔"[۷]

کرب اور خوف کی کیفیات انسان کو لایعنی کیفیت کا شکار کر دیتی ہیں۔ تو وہ ان سے نکلنے کے لیے نت نئے امکانات سے لڑتا ہے۔ نئے راستے کھوجتا ہے۔ افسانے کا کردار بھی بلندی اور اور موت کے خوف سے اکتا چکا ہے۔ اور اب ان کیفیات سے بے زار ہو کر ایک نئے تجربے سے گزرنا چاہتا ہے۔ یہ کیفیت صرف داخلی رجحان کی نہیں بلکہ تمام موضوعی روک ٹوک کی بھی عکاس ہے۔ فرد ایک حد تک سماجی رویوں کا کرب برداشت

کرتا ہے۔ یا پھر ان کا عادی ہو کر ان کی تلخیوں سے تسکین وراحت کشید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یا موت اور خودکشی کی کوشش کرتا ہے یا پھر اپنے وجود کو اسی لایعنی کیفیت سے نکالنے کی تگ ودو کرتا ہے۔ وجودی فلسفے کی رو سے جو فرد داخلی وارداتوں کا سہارا لے کر لایعنیت سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے وہی وجود معتبر وجود کہلانے کے لائق ہے۔ جب کہ نامعتبر وجود ہار مان کر فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔

افسانے کا ایک اقتباس جو زندگی اور سماج کے کرب میں مبتلا ایک فرد کے رویے کی عکاسی کرتا ہے۔

"میں جانتا تھا کہ شدید خواہشات کو مروجہ اخلاقی سہارا نہ ملے تو جھوٹ سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں دوسری بری عادت جان بوجھ کر ایسی غلطیاں کرنا تھا کہ نوبت ڈانٹ ڈپٹ سے مار پیٹ اور اذیت رسانی تک آ جائے کیونکہ اس کے لیے خوف زخم اور منت سماجت میں لذت کے ہزار ہا رنگ اور ہزار ہا پہلو موجود تھے۔"[۸]

افسانہ نگار نے نہایت مہارت سے انسانی رویوں کو پیش کیا ہے۔ یہ معاشرے کے سبھی افراد کا المیہ ہے۔ کہ وہ عمر بھر لایعنی کیفیت سے لڑتے ہیں۔ اس سے نکلنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں بعض درست راستوں کا انتخاب کرتے ہیں اور معتبر ہو جاتے ہیں۔ بعض اس اذیت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی یہی لایعنی صورتحال ان کے شعور و آگہی کو دوام بخشتی ہے۔

افسانہ "آئی ایم سوری ژندی جان"

افسانہ "آئی ایم سوری ژندی جان" افسانوی مجموعہ "ق" سے لیا گیا ہے۔ افسانہ علامتی انداز میں لکھا گیا۔ افسانہ نگار نے یہ افسانہ اپنے اکلوتے بیٹے ژند ماجد کو پریشان دیکھ کر لکھا۔ یہ ایک باپ کی اپنے بیٹے سے معذرت ہے جس نے اسے زبردستی اس دنیا میں لا کر کرب و اذیت میں مبتلا کر دیا۔ افسانہ اول تا آخر وجودی فکر سے بھرپور ہے۔ جس میں زندگی کی لایعنیت اور کرب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانے میں راوی ایک زرد کلغی والے مرغ کی کہانی سناتا ہے۔ جو کئی دوسرے مرغے مرغیوں کے ساتھ ایک بڑے پنجرے میں رہتا ہے۔ اسے کبھی تنہائی کا احساس نہ ہوا نہ ہی زندگی قید لگی کیونکہ وہ دن بھر خوب صورت وادی میں سینہ تان کر گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اس کی پیدائش بھی اسی وادی میں ایک جھیل کنارے ہوئی تھی۔ اسے اپنے بچپن سے جوانی تک سارے دن یاد ہیں کہ کس طرح اس کی ماں انہیں دانہ چگنا سکھاتی تھی۔ بلی کس طرح اس کے

ساتھیوں کا شکار کرتی تھی اور پھر شام کو سلاخوں کے پیچھے بند ہو جانا۔ رفتہ رفتہ زندگی کی بیزاری نے اسے جکڑنا شروع کر دیا۔ وقت تیزی سے گزر گیا ماں نے اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔ اس نے دیکھا سب جنگ میں مصروف ہیں۔ جو جیت جاتا ہے وہی سردار ہے اس کے لیے وہ دن خوشی کا تھا جب اس نے پہلی اذان دی مگر طاقتور مرغوں کو اس کا بانگ دینا پسند نہ آیا اور وہ اس پر جھپٹ پڑے۔ اسے مرغیوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے لیے کشش رکھتا تھا۔ ان کا قرب پانا چاہتا ہے۔ بیماری اس کے خاندان کے کئی مرغے، مرغیوں کو لے ڈوبی۔ اب چند ایک ہی بچے تھے۔ وہ اب آزادی سے مرغیوں کے ساتھ گھوم سکتا تھا۔ اسے اپنی زندگی جی کر اگلی نسل کی کڑی جوڑ کر اس دنیا سے جانا تھا۔ یہ سوچ اسے بیزار کر دیتی تھی۔ وہ اس کشش اور بے ثباتی کی کشمکش سے تھک جاتا۔ وہ بہت عرصے تک خود کو روکتا رہا کہ اپنی طرح کسی اور چوزے کو پنجرے کی سلاخوں تک نہ لائے مگر کب تک ایک دن وہ یہ غلطی کر بیٹھا۔ زندگی کا تسلسل چلتا رہا اور زرد کلغی والا مرغ شرمندہ ہے۔ افسانہ کس لایعنی کرب کی داستان سنا رہا ہے اس کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "یہ دیکھ کر نوجوان مرغ کے دل میں دنیا کی بے ثباتی رچ بس گئی۔ رات کو درخت پر بیٹھا سوچتا رہا یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ بوڑھے سردار نے کیا حاصل کر لیا۔ نیا سردار کیا حاصل کر لے گا۔ لایعنی اور بے معنی پن نے پنجرے کی سلاخوں کو اس سے قریب کر دیا۔ اس نے شدید گھٹن محسوس کی۔"[9]

ہائیڈیگر بھی مستقبل کے بارے میں تردد کو لایعنی کیفیت کی طرح پہلا قدم سمجھتا ہے۔ انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ اسے بنا کسی وجہ کے دنیا میں بھیج دیا گیا ہے۔ یہ تشویش اسے پریشان کن حال تک فکر مند رکھتی ہے۔ وہ اس دنیا میں اپنی موجودگی دوسروں سے تعلقات پر تشویش میں مبتلا رہتا ہے۔ اس طرح وہ لایعنی کیفیات سے نبرد آزما ہو کر نئے تجربات اور مشاہدات سے گزرتا ہے۔ سارتر کسی حد تک ہائیڈیگر کے اس فلسفے سے متفق نظر آتا ہے۔ جس لاشیت اور لایعنیت کو ہائیڈیگر اعلیٰ وارفع تصور کرتا ہے۔ سارتر اسے یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ لایعنیت بھی وجود کی محتاج ہے۔ یعنی سارتر وجود کی معتبری سے آگے کسی شے کو نہیں مانتا۔ سید ماجد شاہ کے اس افسانے میں بھی مرغ کی علامت ایک ایسے فرد کے لیے ہے جو دنیا میں آنے اپنے ہونے نہ ہونے، وجود کی ناقدری، زندگی کی بے مقصدیت اور موت اور فنا کے ڈر جیسی کیفیات کا شکار ہے۔ اس کے خیال میں یہ زندگی

اس پر زبردستی مسلط کی گئی ہے۔ بالکل اس مرغے کی طرح جو بند سلاخوں سے جھانکتا ہے۔ یہ گھٹن کا احساس اسے ناامید کر دیتا ہے۔ اور وہ زندگی کے تسلسل اور نمو سے انکار کر دیتا ہے۔

زندگی کی مشکلات سے تھکنے اور ذات کی بے توقیری کے حوالے سے افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"پہلی رات جو اس میں کھلے آسمان تلے گزاری وہ اس کے دل کی بے رونقی پڑھا گئی تھی اس سے بہت کچھ فضول لگا تھا بے آسرا پن نے اسے دبوچ لیا تھا۔ سلاخیں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتی رہیں۔ گھٹن کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کی سرخ ہوتی کلفی گلابی رہ گئی۔"[۱۰]

تمثیلی انداز میں پیش کیے گئے افسانے میں افسانہ نگار نے خوب صورتی سے فطرت کے تسلسل کو مشاہدات سے جوڑا۔ کھلے آسمان تلے رات گزارنے سے لایعنیت اور لغویت کا احساس ہوتا ہے۔ بے آسرا پن فرد کو جکڑ لیتا ہے۔ افسانے میں بھر بھری مٹی، چھینا چھپٹی، لڑائی جھگڑا، سلاخیں اور زرد کلفی طاقتور لایعنی علامتوں کے طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ جو سماجی پابندیوں جبر اور گھٹن کی کیفیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ تلخ حالات فرد کو بے بس کر دیتے ہیں۔ بے مقصدیت اسے آن گھیرتی ہے۔ اور اس دنیا میں رہنا اور جینا اس کے لیے ایک مجبوری بن جاتا ہے۔ افسانہ "آئی ایم سوری ژندی جان" انہی کیفیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

افسانہ "کسر"

"کسر" افسانوی مجموعے "ق" سے لیا گیا ہے۔ کسر کی کہانی ہمارے معاشرے میں پھیلی اجتماعی لایعنیت، لغویت، کم مائیگی کے احساس اور منافقانہ طرز زندگی کی عکاس ہے۔ کہانی کا آغاز میاں بیوی کے رشتے میں پیدا ہونے والی لایعنی کیفیت اور بے مقصدیت سے ہوتا ہے۔ الطاف اور نورین ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک مشینی زندگی جی رہے ہوتے ہیں۔ جس میں ہر کام کے اوقات کار مقرر ہیں۔ جب رٹے رٹائے مکالمے اور ایک ہولناک چپ زندگی ایک مکینیکل عمل کا نام ہے۔ جس میں نہ کوئی لڑائی، نہ تکرار، نہ محبت اور نہ ہی کوئی شرارت ہے۔ اسی پھیکے پن اور ٹائم ٹیبل پر مبنی زندگی ہی میں ان کے اوپر تلے چھ بچے بھی پیدا ہوئے۔ ان کی ازدواجی زندگی بھی اسی چپ کے سایے میں پروان چڑھی الطاف خوش تھا کہ اس نے بیوی کی اچھی تربیت کی۔ پھر بچوں کی پیدائش نے الطاف کو نورین کی طرف سے مکمل مطمئن کر دیا تھا۔ اسے جذبوں کی کشش سے یوں ہی ابکائی آتی تھی جیسے دکان میں گھی کے کنستر سے ہاتھ گندے ہونے کی چپچپاہٹ سے۔ اس نے کاروبار کو وسیع کر لیا اور ہفتوں شہر سے باہر رہنے لگا۔ ایسے میں ایک نوجوان نورین کی زندگی میں آجاتا ہے۔ بچپن کی محرومی کا

مارا ہوا نوجوان جلدی ہی نورین کی خلوت گاہ تک جا پہنچا۔ نورین کی بے رنگ زندگی پر بھی اچانک بہار آگئی۔ بنجر عورت پھر سے ہری ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ محبت نے اسے ساتویں آسمان پر پہنچا رکھا تھا۔ وہ دونوں سب بھول کر صرف اس خواب میں زندہ تھے۔ لیکن دوسری طرف الطاف گھی کے کنستر سے آج بھی گھن کھاتا ہے جب کہ لوگوں کی چپچپی لیس دار زبانیں اس کے مسلسل تعاقب میں رہتی ہیں۔

افسانہ ایسے ہی کئی سوال چھوڑ کر اختتام پذیر ہوا۔ فرد کی مصنوعی زندگی، اس میں موجود داخلی وارداتوں کا ہیجان، دوسرے افراد سے وابستہ تعلقات، نا امیدی، لغویت اور پھر امید کی فضا جیسے کئی رویے افسانے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ ہر فرد کا مسئلہ ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد کے ساتھ یا سماج کے لیے اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ تو وہ اس لایعنی کیفیت میں جی تو رہا ہوتا ہے۔ مگر اس کے اندر خود شناسی معتبری اور نئے مکانات کا سامنا کرنے کی شدید خواہش بھی پنپ رہی ہوتی ہے۔ مناسب وقت اور موقع آنے پر وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل ضرور کرتا ہے اور اسی حالت میں گناہ و ثواب کے جذبے سے بالاتر وجود کی تسکین زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ کس طرح دو افراد کی زندگی میں لایعنیت نے قبضہ جمار کھا ہے افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "ان دونوں کے درمیان بلا کی خاموشی حائل تھی۔ ایسی خاموشی جس کے بارے میں سوچ کر یقین نہیں آتا۔ کہ میاں بیوی کے بیچ سناٹے کا ایسا رشتہ بھی ہو سکتا ہے پنبہ ذہنی کی ایسی مثال تو کہانیوں میں بھی نہیں ملتی۔ ایسی لمبی چپ جیسے دو ستاروں کے بیچ ہوتی ہے۔ ان دونوں میں شاید کئی نوری سال کا فاصلہ تھا۔ درمیانی خلا سے آواز آر پار نہیں ہو سکتی تھی۔"[11]

فرد کی زندگی میں لگن تڑپ اور حرارت کے عناصر اس کے اثبات کے لیے لازمی ہیں۔ اگر ان داخلی وارداتوں پر قنوطیت طاری ہو جائے تو زندگی سے مسرت اور تسکین کا احساس جاتا رہتا ہے۔ جذبوں کی کشش کے بنا وجود رکھنا ناگزیر سی بات ہے۔ وجود کی جذباتی کیفیات ہی وجود کو یہ احساس دلاتی ہیں کہ وہ دنیا اور اس کے دیگر مظاہر میں اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ رومانویت کے بنا زندگی کا بوجھ ڈھونا دشوار ہے۔ صرف بچوں کی پیدائش کے لیے جسمانی ضروریات کو بروئے کار لانا اہم فریضہ نہیں بلکہ اپنے ساتھ جڑے شخص کے رومانوی جذبوں کی تسکین بھی لازم ہے۔ افسانہ نگار نے بھی ایک ایسے ہی ازدواجی تعلق کو خوبصورت بیانیے میں سمویا ہے۔ جس میں ایک جوڑا لایعنی اور بے مقصدیت سے بھرپور زندگی جی رہا ہے۔ زبردستی اور جبری

طور پر زندگی کی گاڑی کھینچنا ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے ایسے میں فرد مسلسل سفر کی تھکان بھی سہتا ہے۔ کرب بھی جھیلتا ہے۔ مگر ایک مایوسی اور بے سکونی اسے گھیرے رکھتی ہے۔ افسانے میں ہمیں لایعنیت کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ جہاں ایک طرف اجتماعی بے مقصدیت افسانے کا بنیادی پہلو ہے تو دوسری طرف الطاف کی بے توجہی نورین کی زندگی کو لایعنی کرب میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ نوجوان کلرک اپنی زندگی کی تنہائی اور لغویت سے بیزار ہو کر چھ بچوں کی ماں پر فریفتہ نظر آتا ہے۔ افسانہ نگار نے نوجوان کی بے مقصد زندگی کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "اس کا تعلق نوجوانوں کے اس گروہ سے تھا جنہیں ماں باپ سے محبت نہیں ملتی اور وہ خود کو بدصورت سمجھتے ہیں۔ اکثر تنہائی پسند ہوتے ہیں لوگوں سے بھاگتے پھرتے ہیں کبھی کھل کر ہنس نہیں پاتے بلکہ ہنستے ہوئے بھی ہونٹوں کو مروڑ کر ہنسی روکتے ہیں ہر وقت ایک مصنوعی خول میں رہتے ہیں ذرا آہٹ ہوتی تو کچھوے کی طرح منہ ٹانگیں سب غائب ان میں فیصلہ کرنے کی قوت نہیں ہوتی۔"[۱۲]

اس اقتباس کو مد نظر رکھ کر ہم اہم وجودی مفکرین کی نجی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو ہر بات واضع ہے کہ چاہے کرکیگارڈ ہو نطشے یا پھر ژاں پال سارتر، ان کے بچپن کی غربت، عدم توجہی، حقیقی رشتوں سے دوری، محبت کی کمی اور دیگر محرومیوں نے ان کی مخصوص شخصیت کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ افسانے کا کردار نوجوان کلرک بھی ایسی ہی محرومی کا شکار ہے۔ ایسے میں نورین کی ذرا سی توجہ اس کی لایعنی زندگی میں تسکین کا سامان پیدا کر گئی۔ اور وہ اس کی شکل وصورت، عمر اور سماجی حیثیت کی پروا کیے بنا اس کی طرف مائل ہو گیا۔ وہ زندگی کا کرب مسلسل سہتے سہتے عاجز آ چکا تھا۔ دوسری طرف نورین بھی الطاف کی خاموشی، بے توجہی سے تنگ آ چکی تھی۔ دونوں طرف کی لایعنیت نے انہیں ایک نئے امکان کی طرف دھکیل دیا۔ اور وہ انجام کی پروا کیے بغیر اس انجانے سفر کی طرف چل دیے۔ اب ان کا ذاتی تجربہ ہی یہ طے کرے گا کہ ان کی سمت درست ہے یا نہیں کیا وہ معتبر وجود کہلائیں گے؟ یا پھر مذہب اور اخلاقیات کی ڈور تھام کر گناہ و ثواب کا سوچیں گے۔ لیکن سماج کے لیے یہاں کئی نئے سوالات جنم لیتے ہیں۔ الطاف کا سرد رویہ، نورین کی خاموشی اس ہولناک چپ میں چھ بچوں کی پیدائش، شادی شدہ عورت کا نوجوان سے عشق اور ایک نوجوان کا چھ بچوں کی ماں کی طرف مائل ہونا، معاشرہ کس بے مقصدیت اور لایعنیت کا شکار ہے۔ جو اس طرح کی کیفیات پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ کہانی یہاں

ہی ختم نہیں ہو رہی بلکہ وہ چھ بچے جو کہ محبت اور حقیقی رشتوں کی توجہ سے محروم ہو رہے ہیں۔ ان کا مستقبل کیا ہے ؟ کیا وہ اپنی ذات کا اثبات کر پائیں گے۔ یہ ایک مسلسل دائروی چکر ہے جو کسی نہ کسی صورت سماج میں جاری رہتا ہے۔ افسانہ "کسر" ہمارے سماجی رویوں اور باہمی تعلقات پر ایک ضرب کاری ہے جو کہ زندگی کے کرب اور لایعنیت کا دکھ لیے ہوئے ہے۔

افسانہ "صابن"

افسانوی مجموعے "ق" میں شامل افسانہ "صابن" علامتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس میں مرکزی کردار گومگو کی کیفیات کا شکار ہے۔ زندگی کی بے معنویت سے بے زار ہے۔ فرد زمانیت کے تسلسل پر یقین رکھتے ہوئے بھی اس کی تلخیوں سے پریشان ہوتا ہے۔ وہ ماضی پرستی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ مستقبل میں آنے والے لمحات میں سکون چاہتا ہے۔ تو ساتھ ہی لمحہ موجود کے کرب و اضطراب سے بھی نجات چاہتا ہے۔ لمحہ موجود کی اکتاہٹ اسے زندگی کی مہملتا سے روشناس کراتی ہے۔ صابن کی کہانی بھی ایسی ہی ایک لڑکی کے گرد گھومتی ہے۔ جو ماضی کے خوب صورت لمحات کو یاد کر کے خوش ہوتی ہے جب زندگی کے سب رنگ اس کی دسترس میں تھے۔ شادی سے پہلے کی رومانوی زندگی کو یاد کرتی ہے جب وہ دانش سے ملی تھی ان کی دوستی کیسے محبت میں بدلی۔ ان کے پاس گفتگو کرنے کے لیے ہزار موضوعات تھے زندگی استراحت اور سکون سے بھرپور تھی۔ وقت روشنی کی رفتار سے بھی تیز گزرا شادی کے بعد کی زندگی ویسی نہ رہی۔ نہ وہ محبت، نہ گفتگو، نہ وہ تشنگی اور نہ وہ دلچسپ معمولات رہے۔ بے مقصدیت اور لایعنیت نے عجیب تشویش کو جنم دیا۔ وہی روزمرہ کے کام مشینی زندگی دفتری معاملات اور مسلسل اکتاہٹ اس کیفیت نے اسے ڈپریشن میں مبتلا کر دیا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں صابن کی بو آ بسی۔ طرح طرح کے وہم اسے گھیرنے لگے۔ وہ ماضی کی طرف لوٹ جاتی جہاں وہ دانش سے محبت اور ہوس پر گھنٹوں گفتگو کرتی۔ اس کے نزدیک یہ جڑواں بہنیں ہیں۔ ان میں زیادہ فرق نہیں لیکن دانش کے دلائل اسے قائل کر لیتے ہیں کہ ہوس اور محبت میں وہی فرق ہے جو صابن اور عورت میں ہے۔ یہ بات کسی ناگوار بو کی مانند اس کے دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ ڈھلتی عمر اور دلکشی میں کمی کا کرب اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے۔ وہ اس ناگوار بو کو لڑکی سے تشبیہ دیتی ہے۔ ہاں وہی نئی لڑکی جو دانش کی نئی کولیگ ہے۔ وہ ہر بر آہٹ میں شیشے کے سامنے اپنے وجود کو دیکھتی ہے۔ جو بھدا لگنے لگتا ہے۔ جیسے سڑا ہوا پھس پھسا ٹماٹر۔ اسے کئی وسوسے آن گھیرتے ہیں۔ اسے لگتا ہے کہ وہ صابن کی پرانی گھسی ہوئی ٹکیا ہے۔

جسے جلد ہی کسی تازہ خوشبو والی ٹکیا سے بدل دیا جائے گا۔ صابن کو افسانہ نگار نے نہایت عمدگی اور مہارت سے بطور علامت استعمال کرتے ہوئے دو افراد کے درمیان رشتے کی گرفت کمزور ہونے اور خدشات میں گھری ہوئی عورت کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ افسانے سے اقتباس:

"لیکن وقت اب کچھوا چال چلنے لگا تھا بالکل بور تھکا دینے والی کیوں کہ اب ان دونوں میں کوئی ذاتی بات، کوئی آپس کی بات نہیں ہوتی تھی۔ بس روٹین کی وہی باتیں، بچوں کے بارے میں، مہنگائی کے بارے میں، کسی کی شادی کے بارے میں وغیرہ وغیرہ بالکل روٹین کی باتیں۔۔۔ بالکل روٹین کی زندگی۔۔۔ اکتا دینے والی ۔۔۔ڈپریشن طاری کرنے والی۔"[۱۳]

افسانے کا مرکزی کردار بھی الجھن کا شکار ہے وہ اپنے حال سے ناخوش ماضی کے اچھے دنوں کو یاد کرتے ہوئے مسرت حاصل کرتا ہے۔ موجودہ زندگی کی لایعنیت سے بےزار کر چکی ہے۔ لمحہ موجود میں سوائے روزمرہ کے کاموں پریشانیوں اور اکتاہٹ کے سوا کچھ نہیں رکھا ہے۔ طلب اور تڑپ فرد کے طاقتور مصنوعی رجحانات میں یہی جدوجہد اسے آگے بڑھانے میں مددگار ہوتی ہے۔ اگر لگن میں کمی ہوگی تو زندگی لغو ہو جائے گی۔ افسانے کی لڑکی بھی ایسی ہی لغویت اور مہملتا کا شکار ہے۔ حال کی اضطرابی کیفیت اسے فکر مستقبل میں مبتلا کر چکی ہے۔ بجائے وہ اس کیفیت سے نکلنے کے خود کو وہم اور خوف کے حوالے کر دیتی ہے۔ وہ اپنے وجود کو نامعتبر اور مہمل تصور کر لیتی ہے۔ وہ اپنی جگہ کسی کو دینے کا سوچ کر دکھی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کیفیت کو کس خوب صورتی سے بیان کیا ہے ایک اقتباس دیکھتے ہیں۔

"پھر بو کو شدید مہکے نے اسے یادوں کی سنہری وادی سے حقیقت کی بے رنگ اور بوجھل اور ڈپریشن طاری کر دینے والی زندگی کی طرف دھکیل دیا۔ لیکن اب کی بار چاروں طرف پھیلی بونے۔۔۔مایا کا روپ دھار لیا۔ مایا۔۔۔ دانش کی ایک کولیگ۔۔۔ خوبصورت تازہ تازہ۔۔۔ کسی کی نئی خوشبودار صابن کی چاکی کی طرح اکڑی ہوئی تنی ہوئی اور خوش رنگ"[۱۴]

اس اقتباس کو پڑھ کر وجودی ادیب کامیو کی سوچ آڑے آتی ہے کہ انسانی زندگی لغویت سے بھرپور ہے فرد کے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے تو جیے جانے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ افسانے کی لڑکی بھی اسی

کیفیت کا شکار ہے ڈھلتی عمر اور اور حسن میں کمی میں بالکل ایسی ہی بات کے مترادف ہے جیسے کوئی صابن کی ٹکیہ مسلسل استعمال سے گھس کر بے رنگ ہو جاتی ہے۔ اس کی جگہ کوئی تازہ خوشبو دار نئی ٹکیا صابن دانی میں لا کر رکھ دی جائے۔ انسانی فطرت کا یہ دستور ہے کہ وہ بہتر سے بہترین کی تلاش میں رہتے ہیں۔ قانون فطرت بھی یہی ہے کہ چیزیں بدلتی رہتی ہیں۔ ہر پرانی چیز کی جگہ نیا اضافہ ضرور ہوتا ہے۔ دوسری طرف افسانہ لمحہ بہ لمحہ کروٹ بدلتی زندگی اور تیزی سے گزرنے کا احساس دلاتا ہے۔ اور یہ بھی کہ فرد کی ترجیحات بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ جو بدلنے والے سے زیادہ اس سے جڑے افراد پر اثر انداز ہوتی ہے۔

افسانہ "زمین کی چھاپ"

"زمین کی چھاپ" افسانوی مجموعے "ق" سے لیا گیا ہے۔ افسانہ جنگ، دہشت گردی اور خود کش دھماکوں سے پیدا شدہ خوف کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ایسا خطہ جہاں ایک طویل جدوجہد بے تحاشہ قربانیوں کے بعد الگ ملک کا حصول ممکن ہوا ہو۔ لیکن وہ آزادی محض زبانی دعووں تک ہی محدود ہو۔ حقیقیت میں اب بھی موت کا رقص جاری ہے۔ محض سایہ سر پر منڈلا رہے ہیں کوئی خود کش دھماکہ کبھی بھی کسی کی جان لے سکتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک بارہ سالہ بچہ ہے۔ جو اس خونی ماحول سے اس قدر خوف میں مبتلا ہے کہ خواہش کرتا ہے کہ زمین کی یہ چھاپ اس سے چھین لی جائے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہ بچہ اس خاندان کا چشم و چراغ ہے جو آزادی کی جنگ میں پیش پیش تھے۔ اس کا دادا جب آزادی کی داستان سناتا تو اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا اور جذبات کی شدت سے اس کی گردن کی رگیں پھولنے لگ جاتی تھی۔ اس کا تایا اب بھی آزاد عدلیہ کے نعرے لگاتا ہے۔ وہ بے باک، بے خطر، ملکی مسائل پر گفتگو کرتا ہے۔ گویا اسے اپنی جان عزیز نہیں۔ افسانے میں موت کا خوف ایک اضطرابی کیفیت کو جنم دیتا ہے۔ بچہ سوچتا ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ وہ اس علاقے سے بھاگ جائے یا اسے قومی شناخت چھین لی جائے۔ اس دوران پھر خود کش دھماکے کی خبر آتی ہے۔ افسانہ اسی کرب خوف اور لایعنیت کا عکس لیے اپنے اختتام کی طرف رواں ہے۔ بچہ بار بار قومیت بدلنے کی بات کرتا ہے اپنی شناخت اسے موت کے خوف میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ مائیں غم سے ہلکان پتھر کی مورتیاں بن جاتی ہیں لیکن ان کی آنکھوں سے چشمے جاری ہیں۔ ابھی بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو آزادی کی بات کرتے ہیں۔ وہ خود کو مصنوعی آسروں پر زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ خود کو جھوٹی تسلیاں دیتے ہیں کہ امید اور امن کا نیا سورج طلوع ہو گا۔ لیکن نسل نو موجودہ صورت حال سے اکتا چکی ہے۔ ان کے لیے اس پر آشوب دور میں امن

اور آزادی کی بات کرنا اپنے چہرے پر حماقت کا لیپ سجانے کے سوا کچھ نہیں۔ لغویت ان پر طاری ہو چکی ہے۔ اور یہ لایعنیت انہیں قنوطی کر چکی ہے۔ وہ اس خوف سے نکل کر بھاگنا چاہتے ہیں۔ اور کسی اور ملک کا باشندہ بننے کا سوچ رہے ہیں۔ افسانہ نگار نے کس خوبصورتی سے زندگی کی لغویت اور مہملتا کا نقشہ کھینچا ہے ایک اقتباس دیکھیے۔

"یہ خوف ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک اور دھماکہ۔۔۔۔ خودکش ہو گا؟
بچے نے منصوبے سوچنا شروع کر دیے کہ بھاگ کر جائیں تو کہاں جائیں۔
وہ خود سے مجھ سے اور اپنی ماں سے لڑتا ہے کہ آخر یہ ملک چہرے پر
چھپ کیوں جاتے ہیں؟ مورتی کی آنکھوں سے چشمے جاری ہو گئے اور
میں نے لڑکے کو حوصلہ دینے کے لیے دل سے لگالیا۔"[۱۵]

افسانہ خالص اضطرابی کیفیت میں لکھا گیا ہے۔ اکیسویں صدی جہاں اپنے ہمراہ جدید سائنسی انکشافات لائی وہیں مہلک ہتھیار بھی متعارف ہوئے۔ فرد اس پہ لغویت اور تنہائی کا عذاب بھی مسلط ہے۔ دنیا ابھی تک دو عالمی جنگوں کے اثرات سے نہیں نکلی تھی۔ کہ امریکہ میں ۹/۱۱ کا واقعہ، امریکہ کی افغانستان و عراق میں مداخلت، جہادی تنظیموں کی کاروائیاں اور ریاستی دہشت گردی نے اس قدر خوف اور انتشار پھیلایا کہ انسان کی بقا خطرے میں پڑ گئی۔ ان سب حالات میں فرد کی بے مائیگی اور بے چارگی میں اضافہ ہوا۔ زندگی وجودی رویوں سے عبارت ہے اس لیے ان سے پیچھا چھڑانا اس قدر آسان نہیں ہے۔ افسانہ "زمین کی چھاپ" بھی عالمی دنیا کے تنازعات جو کہ ۹/۱۱ سے شروع ہو کر بالاخر ہمارے ملک میں خودکش حملوں کی صورت پہنچے، اس صورت حال کا بیانیہ مختلف ہے۔ مذہب اور قومیت کی بنیاد پر کس قدر شکوک و شبہات ابھرے ان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی صورتحال کو ڈاکٹر افتخار بیگ اپنی کتاب وجودیت اور اردو شعری اظہار میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"اخلاقی اور مذہبی اقدار بری طرح پامال ہوئیں۔ اس دور میں ملائیت کو
فروغ ملا اور مذہبی خبونیت عام ہوئی۔ نتیجتاً شعیہ سنی فسادات بھڑک
اٹھے، مسجدوں اور امام بارگاہوں پر بموں اور کلاشن کوفوں سے حملے
ہوئے۔ انسانی خون بہتا رہا انسان کے من کی دنیا ویران ہوتی
رہی۔ گودیں ویران ہوئیں اور مامتائیں لٹ گئیں۔"[۱۶]

فلسفہ وجودیت کے افکار اور اس کے ابتدائی نقوش جنگ عظیم دوم کے بعد ہی واضح ہوتے نظر آرہے ہیں اور سارتر کی فکر بھی جنگ عظیم دوم میں ہونے والے مظالم دیکھنے کے بعد بدلی اس جنگ میں فرد کی زندگی کو خطرات لاحق ہوئے۔ ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹے اضطراب لغویت، مایوسی، خوف، غربت اور مایوسی نے فرد کو قنوطیت میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ اس نے مذہب سے بھی ہاتھ کھینچ لیا، اس صورت حال میں باشعور افراد کے ذاتی رویے اور انسان دوستی کے جذبے نے فلسفہ وجودیت کو نیا مفہوم دیا۔ تو گویا اب دنیا کے کسی بھی خطے میں ایسی کوئی بھی اضطرابی یا بحرانی صورت حال جنم لے گی تو وہاں فلسفہ وجودیت کا ہونا لازم و ملزوم ہے۔ افسانے کے اختتام میں ایک نئے دھماکے کی خبر آتی ہے۔ بچہ پھر سوال کرتا ہے کہ کیا ہم پلاسٹک سرجری کرا کے چینی یا جاپانی نہیں بن سکتے؟ روتی ہوئی مائیں اجڑی بستیاں اور انسانی لاشوں کی سڑانڈ کے سوا کچھ دیکھائی نہیں دیتا۔ اجتماعی لغویت اور لایعنیت کا منظر لیے افسانہ اپنے اختتام کو جا پہنچتا ہے۔ یہاں بچے کا چینی و جاپانی بننے کی خواہش بھی ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ جو طاقت رکھتا ہے وہ محفوظ رہتا ہے۔ افسانہ لایعنی صورت حال سے نکلنے کی امید بھی دیتا ہے کہ محض آزادی کا نعرہ لگانے سے فرد آزاد نہیں ہوتا بلکہ اصل آزادی تو وہ ہے جب وہ اپنی شناخت کو لے کر پریشان نہ ہو۔ کرب و اذیت سے آزاد ہو کر جی سکے اور اتنا طاقت ور ہو کہ انتشار سے نمٹ سکے۔ چاہے اس کے لیے ناممکنات کی دنیا سے ہی کیوں نہ نبرد آزما ہونا پڑے۔ افسانے کا رجائی پہلو لایعنی صورت حال سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔

افسانہ "اتفاق محض اتفاق"

افسانہ "اتفاق محض اتفاق" سید ماجد شاہ کے افسانوی مجموعہ "ق" سے لیا گیا ہے۔ افسانے کی کہانی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی ہے جو چھ ارب لوگوں کے درمیان بھی اکیلا رہنا چاہتا ہے۔ اس قدر اکیلا کے کوئی بھی اس کے معمولات میں خلل نہ ڈالے۔ انسانوں اور رشتوں سے بھری یہ دنیا ہی اس کے لیے بدمزاج، تلخ لایعنیت سے بھرپور ہے۔ ایسے ہی ایک دن جب گھر والے بھی موجود نہیں ہوتے تو ماجد گھر میں تن تنہا کپڑوں سے بے نیاز، فکر معاش اور فکر دنیا سے پرے زندگی کا اکیلے لطف اٹھا رہا ہوتا ہے کہ دروازے پر گھنٹی بجتی ہے۔ اسے اپنے معاملات میں یہ دخل اندازی بہت ناگوار گزری۔ اس نے آن کے آن میں ان سبھی فلسفیوں کو گالیاں بکیں جو یہ کہتے ہیں کہ انسان آزاد ہے۔ دروازے پر ایک پرانا دوست موجود تھا جو کہ اپنے کسی ذاتی مسئلہ کا حل پوچھنے حاضر ہوا تھا۔ کسی شادی شدہ عورت سے تعلقات تھے اور اس سے ملنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن رات اس نے خواب دیکھا کہ لوگوں نے برہنہ کر کے اس کا منہ کالا کر دیا ہے۔ اب وہ خواب کی کڑیاں آج

کی ملاقات سے جوڑ کر پریشان تھا کہ کہیں خواب سچ ہی نہ ہو جائے۔ ماجد جو پہلے ہی اس کی اچانک آمد سے خائف تھا۔ اس بات کی کہانی کو سن کر مزید سیخ پا ہوا۔ کہ مزید وہ ایک وہم کی بنیاد پر اس کا کل سکون برباد کرنے آ گیا۔ اس نے مصنوعی ہمدردی دیکھائی اور عزم وہمت سے بھرپور تقریر کر کے دوست کو مشن پر روانہ کر دیا۔ اپنا آپ دوبارہ آزاد کر لیا شام کو وہ گھر والوں کو یہ یقین دلاتا رہا کہ اس نے انہیں بہت یاد کیا۔ ایسے میں اس دوست کا فون آتا ہے جو اسے بتاتا ہے کہ وہ تھانے میں ہے۔ افسانہ گو کے ایک مسکراہٹ پر اختتام ہوا اس میں کرب یا تشویش کی کوئی صورت حال نہ تھی لیکن افسانہ "اتفاق محض اتفاق" ہماری مشینی زندگی اور مصنوعی رویوں پر ایک گہرا طنز ہے۔ جو ہمیں سماج کا حقیقی عکس دیکھاتا ہے۔ کہ ہم ہزاروں لوگوں کے درمیان بھی اکیلے ہیں۔ یا اکیلے رہنا چاہتے ہیں۔ مجبوری کے رشتے نبھاتے رہتے ہیں ان کی بات سننا محض مجبوری ہوتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس جس میں افسانہ نگار نے لایعنی کیفیت اور بیزاری کو یوں بیان کیا ہے۔

> "جسم ساکت ہوا اور زبان میں حرکت پیدا ہوئی اور موت سے گالیوں کے جھڑنے پھوٹ پڑے۔ یہ گالیاں ہرگز ہرگز اس ہاتھ کے لیے نہیں تھی جس نے بٹن داب رکھا تھا بلکہ یہ نذرانہ عقیدت ان فلسفیوں کے لیے تھا جو یہ کہہ رہے تھے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ بس ایک منافقانہ قہقہے کے ساتھ اس سے بغل گیر ہوا۔ ڈرائنگ روم کھلا ہونٹوں پر لایعنی قسم کے جملے کمرے کی آتش پڑے سے جھڑنے لگے۔"[۱۷]

نام نہاد ترقی، مشینی زندگی اور مصروفیت نے فرد کو ایک بے مقصدیت اور بے معنی زندگی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ ظاہری دنیا جس قدر حسین اور پر آسائش ہے۔ اتنی ہی مصنوعی ہے ہزاروں لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی فرد تنہائی کا شکار ہے۔ ہم مجبوراً افراد معاشرہ کے ساتھ رہتے ہیں اور مصنوعی تعلقات کا بوجھ ڈھوتے رہتے ہیں۔ پھر کبھی کبھی اکتاہٹ اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ ہم ان سب سے دور تنہا جینے کا جواز تلاش کرتے رہتے ہیں۔ یہ اس اجتماعی لایعنیت کو کچل کر لغویت سے نکلنے کی ایک کوشش ہے کہ انسان تنہائی تلاش کرتا ہے۔ افسانے کے اقتباس میں بھی یہی صورتحال دیکھنے کو ملتی ہے کہ جہاں فرد دوست کی غیر متوقع آمد سے پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گھر بلانے اور اس کی بات سننے پر مجبور ہے۔ وہ اپنی گفتگو اور منافقانہ طرز ماحول کو مزید بدمزہ کر دیتا ہے۔ اختتامی اقتباس ملاحظہ ہو۔

"بہر حال میرے گھر سے سیلاب بلا ٹل گیا میں نے یہ کہے بغیر کہ "کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد دروازہ بند کر دیا اور ان فلسفی صاحبان سے معذرت کی جنھیں کچھ دیر پہلے گالیاں بکی تھیں اور خود کو پھر سے آزاد کر لیا۔ شام کو میں بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھا انہیں یقین دلا رہا تھا کہ میں نے انہیں کتنا مس کیا۔"[۱۸]

وجودی فکر کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہے کہ فرد کے لیے سب سے اہم اس کا وجود ہے۔ اس دور میں بھی اسے اپنے لیے کچھ دیر کی فراغت درکار ہے۔ جہاں وہ اپنی ذات سے ملاقات کر سکے اور من میں بیٹھنے والے سوالات کے جواب ڈھونڈے۔ افسانہ نگار نے بھی فرد کے اسی مصنوعی رجحان کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ جس میں وہ گھر آئے دوست کے جانے پر خوش ہوتا ہے۔ اور دروازہ بند کر کے اپنی آزادی کا لطف لیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف رشتوں کے مصنوعی پن منافقانہ رویے کا یہ عالم ہے کہ شام کو اپنے بیوی بچوں کو یہ یقین دلانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے کہ وہ اس کے لیے کتنے اہم ہیں۔ اور وہ ان کے بنا جی نہیں سکتا۔ حالانکہ حقیقت میں وہ سب سے بیزار ہے اور تنہائی چاہتا ہے۔ یہ دراصل اس چہل پہل والی دنیا سے کچھ دیر کے لیے فرار کی ایک کوشش ہے۔ کیونکہ انسان کولہو کے بیل کی طرح روٹین کی زندگی سے اکتا جاتا ہے۔ اور یہی اکتاہٹ اسے لایعنی کر دیتی ہے۔

افسانہ "رضامندی"

افسانہ "رضامندی" سید ماجد شاہ کے مختصر افسانوی مجموعے "ر" سے لیا گیا ہے۔ افسانے کی کہانی مرسی کلنگ کے گرد گھومتی ہے۔ جس میں ایک قاتل ایک بزرگ شخص کے بیٹوں سے موت کا سودا کر رہا ہوتا ہے۔ باپ کی مسلسل بیماری نے بیٹوں کی زندگی میں خلل پیدا کر رکھا ہے۔ وہ مریض کی حالت دیکھ کر نفسیاتی ہو چکے ہیں۔ اس کے مرنے کی دعائیں بھی کر چکے ہیں۔ آخر قاتل ایک لاکھ روپے میں موت کا سودا طے کرتا ہے پچیس فیصد رقم ایڈوانس جب کہ بقایا چہلم کے بعد لینے کی بات طے ہوتی ہے۔ افسانے کا اختتام قاتل اور مقتول کی ملاقات پر ہوتا ہے۔ جہاں قاتل اسے سمجھاتا ہے کہ یہ زندگی لغو ہے اس سے بہتر موت ہے۔ جہاں صرف سکون ہے۔ یہ بیماری اور لایعنیت کا عذاب دنیا میں ہی رہ جائے گا ایک جنت منتظر ہے۔ یہ جذباتی گفتگو بیمار شخص کو موت کے لیے راضی کر لیتی ہے۔ وجود کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اسے زندگی سے جا بجا

محدودیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی زمانے کی محدودیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی زمانے کی محدودیت اور کبھی مور کی محدودیت آڑے آجاتی ہے۔ یوں وہ اس دنیا میں خود کو لغو تصور کر لیتا ہے۔ کامیو وجود کو واقفیت اور محدودیت کا غلام تصور کرتا ہے۔ ہائیڈیگر بھی اس کے خیالات سے متفق ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کی لغویت اور مہملتا فرد کو تکلیف میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ لیکن دوسری جانب سارتر اور نطشے وجود کو ہر شے سے بالاتر اور مقدم سمجھتے ہیں۔ یہی نظریات نطشے کے تصور "فوق البشر" کو جنم دیتے ہیں۔ لیکن افسوس کے موت ہر شے پر حاوی نظر آتی ہے۔ افسانہ "رضامندی" کامیو اور ہائیڈیگر کے افکار کے گرد گھومتا ہے۔ جس طرح وہ زندگی کی لغویت، واقفیت اور محدودیت وجود پر حاوی تصور کرتے ہیں اس طرح مریض کے گھر والے اس کی مسلسل بیماری اور تکلیف کے پیش نظر اکتاہٹ اور گھن کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا باپ اس لایعنی زندگی سے چھٹکارا پالے اور وہ اس کے بے مقصد وجود سے نجات حاصل کر لیں۔ دوسری طرف بوڑھا بیمار باپ مسلسل بیماری کے کرب میں مبتلا ہے۔ کینسر کا نہ ختم ہونے والا عذاب اس کی زندگی کو ایک بے مقصدیت کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ اس تکلیف سے نجات دلانے کے لیے کس طرح قاتل مرسی کلنگ کے لیے قائل کرتا ہے اس کی جھلک اس اقتباس میں دیکھتے ہیں۔

> "دنیا کا اصل باسی اندھیرا ہی تو ہے۔ اسے سچ جانو یا اسے رب مانو۔ یہی نور کا آخری درجہ ہے۔ جو اس سے وابستہ ہے۔ گھنگھور سناٹا۔۔۔ خوب صورت بادلوں کی طرح چھایا ہوا سناٹا چپ اور ایک ہو کا عالم یہی ہے مکتی یعنی فنا باقی سب فریب دھوکے کا آسیب ہے۔ ہر درد سے نجات ۔۔۔ کینسر سے شدید تکلیف میں ہیں۔ آپ وہاں کوئی تکلیف نہیں۔ ایک دم سکون۔۔۔ بابا جی نے مرسی کلنگ قبول کر لی۔"[19]

موت ایک ایسا خارجی واقع ہے جو زندگی سے ہمارا تعلق ہمیشہ کے لیے توڑ دیتا ہے اگر اس کے منفی پہلو کو دیکھا جائے تو یہ فرد کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک خوف کی صورت فرد پر مسلط رہتا ہے۔ کوئی بھی شخص راحت میں مرنا پسند نہیں کرتا لیکن بعض اوقات ہم موجودہ زندگی سے اس قدر بیزار ہو جاتے ہیں۔ کہ موت سے ڈرنے کی بجائے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ کھلی بانہوں سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ موجودہ زندگی کی اذیتیں جب حد سے تجاوز ہو جاتی ہیں تو ہم یا موت کی دعا کرتے ہیں یا خودکشی کی راہ اپناتے ہیں۔ وجودی مفکرین کے نزدیک موت جسم اور روح کے تعلق کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتی ہے۔ مذہبی وجودی

مفکرین جیسے کرکیگارڈ اور جیسپرز موت کو ایک دوسری زندگی کا آغاز تصور کرتے ہیں کرکیگارڈ موت کو جاندار اور بھرپور جذبہ قرار دیتا ہے۔ ہائیڈیگر کے ہاں یہ ایک اساسی فکر ہے۔ فکر کا ایک رکن امکان ہے۔ جب کہ دوسرا رکن "واقفیت" جو کہ اس دنیا میں پھینکے جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ موت کوئی اتفاق نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ جس سے فرار ممکن نہیں۔ دوسری جانب دیکھا جائے تو موت دوہرے رویے کی مالک ہے۔ جہاں ایک طرف فرد کو لایعنی زندگی سے چھٹکارا دیتی ہے وہیں اس کی آزادی اور وجود کے لیے خطرہ بھی ہے۔ جو اسے فنا کے راستے پر لے جاتی ہے۔ سارتر موت کو فرد کا امکان ماننے سے انکاری ہے۔ اس کے نزدیک یہ ایک خارجی شے ہے جو تمام امکانات کے خاتمے کی وجہ ہے۔ افسانہ "رضامندی" میں بھی افسانہ نگار نے موت کے لیے پہلے رویے کی نشاندہی کی ہے جو انسان کو لایعنی زندگی سے چھٹکارہ دیتی ہے۔ مختار حسین صدیقی اپنے مضمون "موت" وجودی انسان پرستوں کی نظر میں سارتر کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

> "سارتر کے نزدیک موت ایک سراسر لغو خارجی صورتحال ہے۔ جس کا
> ہمیں آزادی بخشنے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اپنی تمام تر لایعنیت کے ساتھ
> ہم پر ظاہر ہو کر ہمیں جملہ قیود سے آزاد کر دیتی ہے۔"[۲۰]

اس اقتباس کی روشنی میں اگر افسانے کا تجزیہ کیا جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے فرد موجودہ زندگی کی لغویت اور خارجی صورت حال کے خوف سے جکڑا رہتا ہے۔ وہ مصیبتوں اور پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے موت کی دعا کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو تنگ آکر خود ہی موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار بھی بیماری کی شدت اور تکلیف سے عاجز آکر مرسی کلنگ قبول کر لیتا ہے۔ یوں موت اپنی تمام تر لایعنیت کے ہمراہ اس کا استقبال کرتی ہے اور اسے تمام جدوجہد سے آزاد کر دیتی ہے۔

افسانہ "مرنے والوں سے معذرت"

مختصر افسانہ "مرنے والوں سے معذرت" ماجد شاہ کے افسانوی مجموعے "ر" سے لیا گیا ہے۔ افسانہ انسانی زندگی کے ضیاع اور اس سے پیدا ہونے والی لایعنی کیفیت کے گرد گھومتا ہے۔ افسانے کا منظر انسانی لاشوں کے ڈھیر، معدے آنتوں کے چھیتڑوں چیخ و پکار اور خوف و ہراس کی فضا پر مبنی ہے۔ "مرنے والوں سے معذرت" دہشت گردی خاص کر خودکش بم دھماکوں کے دوران پیدا ہونے والی خوف کی فضا اور تباہی کے حوالے سے ہے۔ عالمی منظر نامے پر یہ برا وقت بھی دیکھنے کو ملا جب وطن عزیز میں بے تحاشا بے گناہ عوام

کو مارا گیا۔ بازار، سکول اور عبادت گاہوں کو نشانہ بنایا گیا ہر شخص عجیب خوف میں مبتلا تھا کہ نہ جانے کب کس بھیڑ میں کوئی خود کش دھماکہ ہو اور موت اسے اچک لے۔ یہ وہ کیفیت تھی جب یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دشمن کون ہے۔ تماشہ یہ تھا کہ مارنے والا خود بھی ساتھ ہی مارا جاتا۔ پیچھے صرف انسانی گوشت کے لوتھڑے بچ جاتے جن کی شناخت کا ٹیسٹ ممکن نہ تھا۔ ایک دھماکے سے فرصت نہ ملتی کہ کوئی نیا واقعہ پیش آ جاتا یوں دشمن تک پہنچنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔ موت کی اس ارزانی نے بے یقینی کی کیفیت کو جنم دیا۔ محفلیں اجڑ گئیں میلوں، عرسوں اور دیگر تہواروں کی رونقیں ختم ہوئیں۔ عبادت گاہیں خالی ہو گئیں۔ لوگ زندگی کے انوکھے کرب کا سامنا کر رہے تھے۔ زمین آئے روز بے گناہوں کے خون سے سیر اب ہوتی مذہبی جنونیت کو فروغ ملا۔ اخلاقی اقدار معدوم ہوتی گئیں۔ سینکڑوں لاشیں ایک ساتھ ٹکرا ٹکرا کر کے سمیٹی جاتیں۔ ایسے دیگر واقعات نے فرد کو لغویت اور بے مقصدیت کی طرف دھکیل دیا جس کا تذکرہ مصنف نہیں یوں کیا:

"میرا جسم اتنے آنسو نہیں بنا سکتا جتنی لاشیں میرے سامنے بکھری پڑی ہیں۔ آخر لاشوں کا حق ہوتا ہے کہ ان پر رویا جائے اب ایک لاش کے حصے میں آدھا آنسو میں کیسے روک سکتا ہوں؟"[۲۱]

کرب اور خوف کی کیفیت نے بیزاری اور اکتاہٹ کو جنم دیا۔ موت کے اس کھیل نے فرد کو لایعنیت کی طرف دھکیل دیا۔ وہ سینکڑوں مرنے والوں کے لیے کتنا رو سکتا ہے اور کتنی دیر دکھی رہ سکتا ہے۔ لیکن یہی خوف اور اضطرابی کیفیات فرد کے شعور کو جلا بخشتی ہیں۔ وہ اس لغو زندگی سے چھٹکارا پانے کی سعی کرتا ہے۔ فلسفہ وجودیت کا باقاعدہ آغاز بھی انقلاب فرانس جنگ عظیم اول و دوم کے بعد ہوتا ہے یہ وہ وقت تھا جب کروڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ فرد کا ہر شے سے اعتبار اٹھ چکا تھا۔ عالمی سطح پر ایک بے چینی اور بے مقصدیت کی فضا قائم تھی مشینی ترقی اور مذہبی و اخلاقی اقدار کے معدوم ہونے سے فرد کی زندگی میں ایک تنہائی اور خلا آ چکا تھا۔ اس موقع پر بھی فرد کے پاس ایک اپنا ذاتی وجود تھا۔ جس کو وہ قابل اعتبار سمجھ کر دوبارہ زندگی کی دوڑ میں شامل ہوا۔ اس طرح دنیا کے کسی بھی خطے میں جہاں جہاں اضطراب و انتشار نے جنم لیا وہاں وجودیت اور لایعنیت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ لایعنیت فرد کو اس کی محدودیت کا احساس دلاتی ہے۔ وہ زندگی کو بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ گویا اسے اس کی مرضی کے بنا اس دنیا میں پھینک دیا گیا ہو۔ یوں وہ اپنی جامعیت کی تلاش میں نکلتا ہے۔ کبھی خدا کو تلاش کرتا ہے کبھی ماورائیت کے دامن میں تلاش کرتا ہے۔ لیکن آخر کار خود کو موت کے حوالے کر دیتا ہے جو کہ آئلی امکان ہے۔ فرد عمر بھر ان امکانات کی جستجو میں رہتا ہے جو اسے لایعنیت

کے دائروں سے دور لے جا سکیں۔ نئے امکانات کی تلاش ہی منفیت کے غار سے امید کا روشن سورج طلوع کرتی ہے۔ افسانہ "مرنے والوں سے معذرت" بھی کرب دکھ اور لایعنیت کی فضا سے نکلنے کی ایک سعی ہے۔ جسے کالی رات کے بعد ایک روشن صبح آتی ہے۔ فرد عمر بھر اسی کشمکش میں گزار دیتا ہے۔ کبھی دنیا اس پر حاوی ہو جاتی ہے اور کبھی وہ دنیا کو زیر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۵، ص۹۹

۲۔ سید ماجد شاہ، ق، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶، ص۹

۳۔ ایضاً، ص۴۲

۴۔ ایضاً، ص۴۰، ۳۹

۵۔۔ ایضاً، ص۵۷

۶۔ ایضاً، ص۶

۷۔ ایضاً، ص۴۷

۸۔۔ ایضاً، ص۷۶، ۷۵

۹۔ ایضاً، ص۱۰۹

۱۰۔ ایضاً، ص۱۰۵

۱۱۔ ایضاً، ص۸۷

۱۲۔ ایضاً، ص۸۸

۱۳۔ ایضاً، ص۱۱۶

۱۴۔ ایضاً، ص۱۱۷

۱۵۔ ایضاً، ص۱۳۲

۱۶۔ افتخار بیگ، ڈاکٹر، وجودیت اور شعری اظہار، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶، ص۱۰۹

۱۷۔ سید ماجد شاہ، ق، ص۴۶، ۴۵

۱۸۔ ایضاً، ص۴۶

۱۹۔ سید ماجد شاہ، ر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸، ص۹۳

۲۰۔ خالد محمود (مرتب) ژاں پال سارتر ادب، فلسفہ اور وجودیت، نگارشات پبلشرز، لاہور، ص۶۰۵

۲۱۔ سید ماجد شاہ، ر، ص۱۰۷

باب سوم: سید ماجد شاہ کے افسانوں میں تصور آزادی

الف۔ تصور آزادی کا وجودی پس منظر

انسانی زندگی کی محدودیت فرد کو تاحیات ایک کرب میں مبتلا رکھتی ہے۔ اس دوران انسان کی آزادی اس کے اضطراب کا سبب ہوتی ہے۔ وجودی فلسفہ کا سب سے اہم موضوع فرد کے فیصلے، انتخاب اور ذمہ داری سے مشروط ہے۔ فلسفہ وجودیت میں آزادی سے مراد فرد کی انفرادی آزادی مقصود ہے۔ یعنی کمال وجود کے حصول میں کوئی بھی طاقت فرد کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتی ہے۔ اس صورتحال میں فرد کا فہم اور جوہر بھی مخل نہیں ہو سکتا۔

فلسفہ وجودیت میں آزادی "لایا نہیں" کے ہیں یعنی فرد کا اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی بھی انتخاب کر سکے اور وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار خود ہے۔ وجودی مفکرین کے ہاں آزادی اور وجود ایک ہی شے نظر آتے ہیں ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا دونوں کو بے معنی کرنے کے مترادف ہے۔ بظاہر تو یہ تصور آزادی بڑا ہی پیچیدہ معلوم ہوتا ہے لیکن سارتر کے ہاں یہ بڑا واضح اور قابل فہم ہے۔ اس کے نزدیک تمام صلاحیتیں اور احکامات فرد کی ذات میں سمٹے ہیں جن کو بروئے کار لانے کی ذمہ داری فرد کی اپنی ہے۔ تصور ذمہ داری اور تصور آزادی ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ انسان اپنے تمام افعال کا ذمہ دار خود ہے اور ان کی ادائیگی اور عدم ادائیگی اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن سارتر کے تصور آزادی میں خدا کی عدم موجودگی کئی نئے سوالات کو جنم دیتی ہے۔ اس کے برعکس یاسپرس کا نظریہ آزادی زیادہ مقبول نظر آتا ہے۔ جس کے مطابق وجود کا جوہر تب ہی ظاہر ہوتا ہے جب فرد موت اور اذیت کے سامنے کھڑا نظر آتا ہے اس وقت وہ اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرتے ہوئے کسی ماورائی سہارے کی طلب کرتا ہے یا خدا کے وجود کا متلاشی ہوتا ہے تو خدا کے انکار کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی کیونکہ اگر وہ خدا کے وجود کو مان لیتا تو بہت سی چیزوں اور ناکامیوں کی وجہ مذہبی عقائد کو مانا جاسکتا تھا لیکن ایسا نہ کر کے تمام اچھے برے افعال کی ذمہ داری وہ اپنے سر لیتا ہے۔ وجودی فلسفہ میں ہمیں تصور آزادی جہد و عمل کے موضوع میں نمایاں نظر آتا ہے۔

وجودی فکر میں تصور آزادی وجودیت ذرا گہرے مفہوم کا حامل ہے دیگر تمام فلسفہ غالب عقلی تصورات اور نظاموں کے متعلق ہی محنت کرتے نظر آتے ہیں ایسے میں فرد مسلسل نظر انداز ہوتا آیا۔ بظاہر فرد نے جتنی بھی ترقی کر لی معاشی لحاظ سے مضبوط ہوا لیکن یہ معروضی حقائق عقلیت اور سائنسی ترقی اسے کسی

صورت مطمئن نہیں کر سکی۔ ایسے میں فرد کی موضوعیت نے اسے سہارا دیا وہ اپنے من میں اٹھنے والے پہلے سوال میری ذات کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ کا جواب اپنے ہی جذب دروں سے حاصل کرتا ہے۔ فرد کا خود کو تمام اشیاء پر حاوی اور مکمل نچوڑ تصور کرنا ہی ایک ٹھوس دلیل اور آزادی ہے۔ کرکیگارڈ اور مارسل کے نزدیک موضوع اور معروض کا بنیادی رشتہ ہی آزادی کہلاتا ہے جو کہ فرد کو دنیا سے جوڑتا ہے اور خود کو منوانے کی کوشش میں جدوجہد کرتا ہے۔ یہی جدوجہد آزادی ہے۔ ڈاکٹر افتخار بیگ اپنی کتاب میں آزادی کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ بات طے ہے کہ وجود دنیا سے مربوط ہوا کرتا ہے اور اس کے فیصلے
اس کے موضوع سے جنم لیتے ہیں۔ اپنے موضوع پر انحصار اپنے آپ کو
منوانے کی یہی جدوجہد آزادی یا حریت پر منتج ہوتی ہے"۔ (۱)

انسان بذات خود وہی ہے جو وہ خود کو بناتا ہے۔ ساتر کے نزدیک انسان کے ہونے میں اس کے تصور کو زیادہ دخل ہے بجائے ارادے کے اس کا من اسے سب کر گزرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہی اثبات ذات ہے۔

عقلیت پسندوں نے ہمیشہ وجودیت کو قنوطیت کا فلسفہ قرار دیا بلکہ بعض تو اسے فلسفہ ماننے سے ہی گریزاں رہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ فرد کی ذاتی فکر پر منحصر ہے۔ وہ قنوطی رویے اختیار کرے یا زندگی کی تلخیوں سے رجائیت کے پہلو نکالے اپنی ذات کے اثبات اور استواریت کو ثابت کرنے کے لئے فرد زندگی کے مسائل سے الجھتا ہے۔ اس صورتحال میں اپنی موضوعیت پر گہرا یقین اور احساس ذمہ داری ہی اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ اپنا نیا جہان تخلیق کر سکتا ہے۔ کامیو کے ہاں پایا جانے والا باغی رویہ بھی اسے حوصلے اور عزم کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ نکولائی باردیو نے فرد کی تخلیق کو ہی اس کی آزادی کا مظہر قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک فرد کی شخصیت نہ تو سماج کی دین ہے نہ ہی موروثی بلکہ یہ آدمی کا تصور آزادی ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ فلسفہ وجودیت میں ذمہ داری کا مفہوم سمجھنے کے لیے سارتر کے نزدیک انسان اپنے تمام اعمال جذبات واحساسات کا ذمہ دار خود ہے۔ انتخاب واعمال کی یہ ذمہ داری ہی انسان کو آزادی کی ترغیب دیتی ہے۔ جس کے تحت وہ اپنے تمام فیصلے خود کرتا ہے۔ لیکن انتخاب کا غلط ہو جانا یا ناکامی کی صورت میں یہی آزادی اور ذمہ داری فرد کے لیے ذہنی پریشانی کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ بعض اوقات ہم سے آزادی اور ذمہ داری کا یہ بوجھ اٹھایا نہیں جاتا تو ہم محفوظ پناہ گاہ ڈھونڈتے ہیں۔ جس کو عقیدہ کہا جاتا ہے۔ جن پر الہیاتی وجودی مفکرین تو

ایمان رکھتے ہیں مگر سارتر اور اس کے ہمنوا اسے عقیدوں کے نام سے پکارتے ہیں۔ سلطان علی شید اذمہ داری اور آزادی سے متعلق رقمطراز ہیں۔

"اپنے وجود کی اصلیت سے انکار کرنا اور اس کے نتائج کو نہ ماننا آزادی ذمہ داری اور ان سے پیدا ہونے والی تشویش وہ اٹل حقائق ہیں جو انسانی وجود میں لازم و ملزوم ہیں اور ان سے انکار اپنے وجود سے انکار کرنا ہے۔"(۲)

وجودی مفکرین چاہے جس قدر اختلافات کا شکار ہوں وہ ایک بات پر متفق ہیں کہ وجود ہر شے پر مقدم ہے تو پھر ان میں ذمہ داری کو قبول کرنے کی عادت ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ مقصد حالات کا دیا ہوا کرب انسان کی زندگی کو ایک مقصد عطا کر جاتا ہے اور وہ پہلے سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ بہترین فیصلے کرتا ہے۔ انتخاب کی کامیابی اور ناکامی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور اپنی آزادی کی حفاظت کرتا ہے۔

آزادی دہشت کے وجود سے جنم لیتی ہے۔ اس طرح شعور اور آزادی فرد کے لیے روح کی حثیت رکھتے ہیں فرد اپنے شعور اور آزادی کا استعمال کر کے ممکنات کی دنیا سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے اعمال کا ذمہ دار خود ہوتا ہے اگر انسان آزاد نہیں تو موجود نہیں بلکہ محض ایک بے حیثیت شے ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ فرد کا تعلق آزادی سے ہے۔ انبوہ سے نہیں انبوہ(Mass) جس کے معنی اژدھام اور بھیڑ بھاڑ کے لیے جاتے ہیں یعنی زندگی کے ہنگاموں اور عدم آزادی جیسی ظالم اور طاقتور قوتوں کو انبوہ کا نام دیا جاتا ہے۔ انبوہ عدم آزادی عدم وجود جیسی حقیقت ہے۔ جس کا فیصلہ فرد خود نہیں کرتا بلکہ بعض خارجی محرکات اس پر اثر انداز ہوتی ہیں، جو باقاعدہ ایک نظام سے جڑی ہوتی ہیں اور جو بھی فکر یا شے کسی مفید نظام کا حصہ ہو وجودیت ایسے تمام لگے بندھے نظاموں کے خلاف بغاوت کا نام ہے۔ انبوہ بھی خارجی قوتوں کا دیا ہوا فیصلہ ہے۔ اس لیے اسے اپنا نام خود کو آزادی سے محروم رکھنے کے مترادف ہے۔ انبوہ جدید سائنسی زندگی کی دین ہے جس نے انسان کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے فرد اپنی آزادی اور انبوہ میں فرق نہیں کر سکتا۔ آزادی اور انبوہ میں انیس بیس کا فرق ہے۔ اس لیے آزادی اور انبوہ میں سے کس کو چنا ہے یہ ذرا مشکل صورتحال اور انتخاب ہے۔ انبوہ اور آزادی میں طرفین کا فاصلہ ہے۔ جو دو ساتھ چلتی سیدھی لکیریں ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل پاتی ہیں۔ انبوہ ایک مشکل صورتحال ہے جو کہ زندگی کی خوبصورتیوں کا گلا گھونٹتی ہے۔ یہ جدید شہری اور صنعتی زندگی کی پیداوار ہے۔ جس نے انسانی آبادیوں کو انسانی جنگل میں بدل رکھا ہے۔ انبوہ

اور تیز رفتار سائنسی زندگی نے فرد سے موضوع احساسات چھین کر اسے خوف کے حوالے کر دیا ہے۔ ہستی اور نیستی کے وجود سے آزادی جنم لیتی ہے۔ سارتر کے ہاں آزادی کا تصور منفیت پر قائم ہے اس کے خیال میں اشیاء سے انحراف کرنا خود کو آزادی فراہم کرنے کے مترادف ہے۔ انسان اپنے تمام افعال کا ذمہ دار خود ہے۔ کرکیارڈ کے ہاں جذبہ حریت فرد کے اندر جستجو کو زندہ رکھتا ہے۔ آزادی کا شعور اس کے فیصلوں میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ حالانکہ مشکلات اور کرب میں گھرے فرد کے لئے ہر فیصلہ خطرے کی علامت ہے۔ فریڈرک اور نطشے نے بھی روایتی نظام سے بغاوت کا نعرہ لگایا وہ بھی فرد کی آزادی کا علمبر دار تھا۔ وہ فرد کو با اثر اور مضبوط رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا تصور "فوق البشر" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

سید ماجد شاہ کے افسانوں میں تصور آزادی

سید ماجد شاہ نے عوامی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے لہذا ان کے افسانوں میں ہمیں شخصی آزادی کے حوالے سے کافی مواد نظر آتا ہے۔ ان کے کردار جابجا ہمیں سماجی، تہذیبی اور اخلاقی جبر کے خلاف لڑتے نظر آتے ہیں۔ خاص کر شخصی جبر آزادی اور انبوہ کے حوالے سے ان کے افسانوں میں موجودہ زندگی کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عامر سہیل کتاب "ر" پر اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں:

> "ان کہانیوں میں آپ کا واسطہ ایسے تجریدی تحیر سے پڑتا ہے جس کی تمام جہتیں کسی نہ کسی حوالے سے وجود کے ساتھ منسلک ہیں اور امکانی تعبیرات میں زندہ رہنے کی کوشش ہے۔ یہ کہانی اس انسان کی بھی ہے جو انتخابی صلاحیت رکھنے کے باوجود جبر کی فضاؤں میں اپنی پس انداز قوتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔"(۳)

سید ماجد شاہ کے افسانوں میں ایسے کردار ہیں جو اپنی موضوعی قوتوں سے زندگی کے نئے امکانات سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور قوت ارادی سے اپنی شخصی آزادی کو حاصل کرنے کی جرات کرتے ہیں۔ بعض کردار سماجی جبر کے خلاف آواز اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح وجودی تعلقات (جنسی پیچیدگیوں) اور غلط پیوند کاریوں کے حوالے سے بے شمار افسانے ملتے ہیں۔ جن میں آزادی اور انبوہ کا فرق سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ زیر بحث باب میں ہم سید ماجد شاہ کے افسانوں میں وجودیت کے تصور آزادی کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

افسانہ "میں ہوں تو میرا سایہ بھی ہے"

افسانہ "میں ہوں تو میرا سایہ بھی ہے" سید ماجد شاہ کے افسانوی مجموعے "ق" سے لیا گیا ہے۔ افسانہ اپنے موضوع سے ہی ذات کے اثبات کی گواہی دیتا ہے۔ افسانہ نگار نے علامتی انداز میں فرد کی اہمیت اور اس کے وجود کی پہچان کو اپنی کہانی میں برتا ہے۔ کہانی ایک ایسے فرد کے گرد گھومتی ہے جو اپنے قبیلے میں دوسروں سے الگ سوچتا ہے۔ اس کے اس باغی رویے سے میر کارواں نالاں ہے۔ مگر وہ اثبات ذات کے لیے کوشاں نظر آتا ہے۔ وہ لگے بندھے نظام سے اس قدر اکتایا ہوا ہے۔ کہ اسے روز ایک ہی وقت پر سورج کے طلوع ہونے اور روشنی کے بکھرنے سے بھی اذیت ہونے لگی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ تیز کرنوں کی روشنی اس کی بینائی چھلنی کر رہی ہے۔ دوسری طرف اسے اپنے سائے سے خوف آرہا ہے جو اس کے قد کو چھونے لگا ہے۔ مصنف نے اس کیفیت کو افسانے میں یوں بیان کیا ہے:

> "چلتے چلتے میری نظر اپنے سائے پر پڑی کچھ گڑبڑ ہے میں نے سوچا ادھر ادھر دیکھا میرا سایہ میرے قد کو چھونے لگا تھا۔ ہم سفروں کے سائے اتنے منہ زور نہ تھے۔ میر کارواں نے تو سائے کو یوں پاؤں تلے دبا رکھا تھا کہ وہ بے چارا سانس بھی نہ لے سکتا تھا۔ میرا سایہ عارضہ بن گیا۔"(۴)

اقتباس ہمارے سیاسی اور سماجی طرز زندگی کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے جس میں سربراہ سے لے کر تمام افراد معاشرہ سب کے سب ایک لگے بندھے نظام پر زندگی گزارنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ وہ اتنے بے بس اور روایات کے اسیر ہیں کہ اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتے لیکن ایسے میں ایک شخص ہے جو سوچتا ہے کہ جزو کل کو بناتا ہے نہ کہ فرد کی ذات کل کے تابع ہو کر اپنی اہمیت کھو دے۔ یہ افسانہ بھی اثبات ذات کی کڑیاں کھولتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار خود کلامی کی کیفیت میں ہے۔ وہ مسلسل اپنے بڑھتے ہوئے سائے سے الجھتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے خیال سے اس سائے کو اس سے نسبت ہونی چاہیے لیکن وہ اس کے قد سے بھی اضافی ہوتا جارہا ہے۔ میر کارواں اس سے سخت ناراض ہے وہ مسائل کا حل سوچتا ہے وہ میر کارواں کی بات سن کر سورج کو سر پر رکھ کے سورج کی رفتار سے قدم ملا کر چلتا ہے مگر پھر وہی سایہ قد سے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک میر کارواں کے سائے سے بھی تجاوز کر گیا۔ آخر کار اسے قافلہ بدری کا حکم سنایا جاتا ہے۔ وہ درخواست کرتا ہے کہ اسے قبیلے سے نہ نکالا جائے۔ یہ سایہ تو کچھ نہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ اگر میرا وجود ہے تو یہ سایہ بھی ہے۔ میر کارواں اس کی بات سے اتفاق کر لیتا ہے کہ سائے سے وجود نہیں بلکہ وجود سے سایہ بنتا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر افتخار بیگ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"وجود اپنی قوت ارادی پر بھروسہ کرتا ہے اور یہ قوت ارادی اسے
آزادی کی طرف راغب کرتی ہے کیونکہ صرف اسی صورت میں وجود
اپنے ہونے کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔"(۵)

ہم دنیا کے سیاسی اور سماجی نظام پر اگر ایک نظر ڈالیں اور اگر تاریخ کے اوراق پلٹیں تو گزرے ہوئے کل سے لے کر آج تک فرد مذہبی، سیاسی اور اخلاقی نظاموں میں جھگڑا رہا اگر ہم دنیا کے بڑے انقلابات جیسے انقلاب فرانس اور پھر دو عظیم جنگوں کے برپا ہونے اور ان کے نتائج کو سامنے رکھیں اور پھر فرد کی انفرادی آزادی اور وجود کے اثبات کا مطالعہ کریں تو واضح ہے کہ فرسودہ نظام مذہب کے ٹھیکیداروں اور مسلط حکمرانوں نے ہمیشہ فرد کو ایک غیر ضروری شے سمجھا اپنے فائدے کے پیش نظر لاکھوں افراد کا خون بہادیا گیا۔

زندگی کے اس سستے پن نے فرد کو عجیب خوف اور تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اسی خوف اور تشویش نے فرد کے اندر ایک اضطراب کی کیفیت کو جنم دیا۔ اس نے اپنے ہی وجود سے طاقت لی۔ اس نے مذہب اور اخلاقیات کو پس پشت ڈال دیا ہر دور میں باغی پیدا ہوتے رہے۔ سزا پاتے رہے اور خونی اور فرسودہ نظاموں کے خلاف آواز اٹھاتے رہے انہوں نے اپنی قوت ارادی سے طاقت لی اور آزادی کی طرف راغب ہوئے۔ جدوعمل کا یہی سلسلہ فلسفہ وجودیت میں جذبہ حریت کو جنم دیتا ہے۔ افسانے میں "میں ہوں تو میرا سایہ ہے" بھی اسی کیفیت کو بیان کرتا ہے کہ کس طرح ایک شخص روایتی نظام سے بغاوت کرتا ہے کہ اس کے افکار کی گونج حکمران نے وقت تک جا پہنچتی ہے۔ میر کارواں اسے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ فرد اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی سوچ اس کے وجود سے مشروط ہے۔ یہ وقتی تسلی میر کارواں کو مطمئن کر دیتی ہے۔ مگر جب قافلے میں ایک بار اثبات ذات کی چنگاری بھڑک اٹھے تو فرد کی آزادی کی راہ میں کوئی بھی رکاوٹ مانع نہیں آسکتی۔ افسانہ دراصل اشرفیہ کے ساتھ برابری کے حقوق حاصل کرنے والے ایک ایسے مسنگ پرسن کی کہانی ہے جو روایتی نظاموں اور حکمرانوں کے رویے سے نالاں نظر آتا ہے وہ معاشرے میں اپنے وجود کی اہمیت کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ یکساں انسانی اور معاشرتی حقوق حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے تاکہ وہ ہزاروں افراد میں اپنا ایک الگ مقام بنا سکے۔ اس کا وجود اس کی پہچان ہو۔ وہ اپنے انتخاب اور اعمال کا خود ذمہ دار بنے انتخاب اور اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنا ہی آزادی ہے یعنی موجودہ نظام کی نفی کر کے اپنا ایک الگ راستہ چننا اور ایک معتبر وجود کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنا ہی شخصی آزادی ہے۔

افسانچہ "ہائے زمانے"

مختصر افسانچہ "ہائے زمانہ" سید ماجد شاہ کے مختصر افسانوی مجموعے "ر" سے لیا گیا ہے۔ ہائے زمانے کی کہانی ہماری صدیوں کی تہذیب اور ثقافت کا آئینہ لیے ہوئے ہے۔ جس میں آزادی اور اثبات ذات کی بات کرنے والوں کو وقتی کی مذاق کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن وقت نے انہیں انقلابی کا درجہ دیا۔ یہ افسانچہ ہماری معاشرتی اقدار اور اخلاقی روایات پر ایک طنز بھی ہے، جو فرد کو گناہ و ثواب کے معیارات میں الجھا کر اسے معاشرے کا ایک نامعتبر وجود ثابت کر دیتے ہیں۔ ایسا وجود معاشرے کے لیے محض ایک بوجھ کی طرح ہوتا ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک شے سے بڑھ کر نہیں ہوتی ہے۔ کئی صدیوں سے انسانی افکار و خیالات کا مرکز عقل و مذہب سے ہی بحث کرتا نظر آتا ہے۔ جس میں اعلی اخلاقی اقدار قائم کر کے فرد کو کل نظام کا ایک معمولی حصہ سمجھا جاتا رہا۔ اس دوران فرد مسلسل نظر انداز ہوتا رہا۔ وہ جدید معاشی و سیاسی نظاموں اور عقل پرستی سے تسکین نہ حاصل کر پایا۔ اس کے من میں کئی سوالات نے جنم لیا جو کہ اس کی ذات سے منسوب تھے۔ دنیا کا حصہ بننے کے لیے معروض و موجود کا تعلق ہونا لازم تھا۔ اس لئے فرد واپس اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں ہوا۔ اسی کیفیت کو افسانہ نگار نے اپنی تحریر میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

> "برائی عیاں ہو کر رہتی ہے یاد رکھنا برائی کبھی چھپ نہیں سکتی۔ یہ دروازہ بند کر کے سمجھتے ہیں کہ سب کچھ چھپا لیں گے۔ دیکھ لینا یہ آہن و چوب کا مضبوط دروازہ جو آج کل ہماری ہمت سے بڑھ کر مقفل کر دیا گیا۔ آنے والا زمانہ خود اس کی غلاظت کو شکار کر کے رہے گا۔"(۶)

انسان پیدائشی طور پر پرانی روایات اور سماجی و مذہبی پابندیوں میں جھگڑا ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت اپنی اقدار کے دائرے میں نمو پاتی ہے۔ مگر جبر مسلسل سے تنگ آ کر ہمیشہ باشعور افراد نے باغیانہ روش اختیار کی زندگی کے امکانات سے مسلسل نبرد آزما رہنے والا فرد ایک دن جہد مسلسل جو ہمہ وقت اس کے وجود میں جاری رہتا ہے ایک دن ان فرسودہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ موضوعی احساسات فرد میں احساس آزادی کو جنم دیتے ہیں۔ یہ مختصر افسانچہ بھی انہی موضوعی کیفیت کا عکس لئے ہوئے ہے۔ جن میں فرد عقلی دنیا سے دور موضوعیت کا احساس لئے ہوئے ہے۔ جو اس کی اجتماعی اور سماجی زندگی کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہیں۔ پرانی روایات کی شکست و ریخت سے ہی نئے فلسفے اور نئے نظام وجود میں آتے ہیں۔ افسانہ نگار نے ایسی ہی کیفیت کو بخوبی بیان کیا ہے کہ کیسے پارسائی اور اخلاقیات کے جھوٹے دعوے دار بے نقاب ہوتے ہیں، کیسے فرسودہ روایات دم توڑ دیتی ہیں۔ خاص کر اگر انقلاب فرانس کے بعد کے حالات کو دیکھا جائے تو باشعور افراد

نے مروجہ مذہبی اور سیاسی حالات سے بغاوت شروع کر دی۔ انہوں نے کلیسا کے غیر ضروری اختیارات اور مذہبی ٹھیکیداروں پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ ان انقلابی خیالات کے اثرات پر جمیل احمد مجبیٰ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"انقلابی خیالات نے مذہب اور کلیسا کو سخت ضرب لگائی۔ کلیسا کی بنیادیں ہل گئیں روحانی آدرشوں کے خلاف ایک فضا تیار ہوئی۔ راسخ العقیدگی کی لے دھیمی پڑ گئی۔ قرون وسطی کی مذہبی اجارہ داری کا قلع قمع ہوا۔"(۷)

یہ عہد پرانے خیالات اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک واضح خط کھینچے ہوئے ہے۔ یہ دور انسانی شعور اور فرد کے اثبات کا ابتدائی دور تھا۔ جہاں سامراجی طاقتوں نے دم توڑا اور عام آدمی کو اپنے وجود کی معتبری کا احساس ہوا یہی احساس فرد کو جہد مسلسل کی طرف راغب کرتا ہے اور جہد مسلسل جذبہ حریت کو تقویت دیتا ہے۔ موجود کی نفی کرنا ہی فلسفہ وجودیت کی رو سے آزادی ہے اور وہی لوگ جو اس زمانے کے باشعور فرد کو قنوطی اور خبطی سمجھتے تھے زمانہ گزرنے کے بعد انہیں لوگوں کو عظیم فلسفیوں کی گنتی میں گنا گیا۔ جس کا اظہار "ہائے زمانہ" میں سید ماجد شاہ نے یوں کیا اقتباس ملاحظہ ہو:

"اتنے عرصے میں برائی قبول صورتی کے پیراہن سے ہوتی ردا کی دیوار پھلانگتی عین فرض ہو چکی تھی لیکن پھر بھی ماہرین نے نوشہ دیوار پڑھ لیا ہے وقت کی دیمک نے لاشوں کو بانی کی حیثیت سے بابائے انقلاب اور مادرے انقلاب کا درجہ دے دیا تھا۔"(۸)

فلسفہ وجودیت اور وجودی مفکرین کو بھی ایسے ہی جھٹلایا جاتا رہا اسے مکمل طور پر قنوطیت کا فلسفہ زندگی سے مایوس افراد کی خود کلامی قرار دیا گیا۔ حالانکہ وجود کا اثبات ہر باشعور فرد کی ضرورت ہے۔ ہر کوئی اہمیت چاہتا ہے۔ اپنی پہچان اسے عزیز رہتی ہے۔ ہر شخص کے ذہن میں اپنے وجود کے اثبات اور احساسات کو لے کر سوالات جنم لیتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی مرضی کی زندگی جینا چاہتا ہے جس میں وہ تمام دقیانوسی نظاموں اور فرسودہ اخلاقی روایات سے آزادی چاہتا ہے ایسے ہی تصور آزادی کا ذکر ہمیں سید ماجد شاہ کے افسانے میں ملتا ہے فرد نے مذہبی اور اخلاقی نظاموں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی تو اسے دیوانے کا خواب کہا گیا۔ لیکن زمانے گزرے تو وہ چنگاری آگ ہوئی زنجیریں ٹوٹیں اذہان نے سوچنا شروع کیا وقت نے انہی لوگوں کو انقلابی

کہا کل جن کے افکار کو کوئی اہمیت نہ دی گئی تھی یہ وجود کی موضوعی زندگی اور فکری آزادی کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔

مختصر افسانہ "مذاق نہ کر"

مختصر افسانہ "مذاق نہ کر" سید ماجد شاہ کے مختصر افسانوی مجموعے "ر" سے لیا گیا ہے۔ "مذاق نہ کر" ایک علامتی افسانہ ہے افسانے کی کہانی وجود اور روح کے تعلق کے گرد گھومتی ہے جس میں روح کو ایک نامعتبر وجود کے ساتھ رہنے کا افسوس ہے اس نے سارا وقت قید میں گزارا کبھی روح اور وجود کا تعلق نہ بن سکا۔ فلسفہ وجودیت کی رو سے وہ تمام افراد جو اپنے موضوعی جذبوں کو اہمیت نہیں دیتے اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے نہ ہی جہد عمل و انتخاب کے فیصلوں میں آزاد ہوتے ہیں وہ سب موجود نامعتبر وجود کہلاتے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر زندگی دوسروں کے بتائے ہوئے نظام اور حکم پر گزار کر خود کو موت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس کیفیت کو لکھاری نے اپنی تحریر میں یوں بیان کیا ہے:

> "ایک روح میں دوران پرواز با آواز بلند خود سے کہا۔ "کتنا بیکار عمل تھا ایک جسم میں رہنا ساتھ سے گزرنے والی دوسری روح نے چونک کر دیکھا اور پرواز کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا" ارے اداس روح تو کس کی قید میں رہی؟ پہلی رونے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔ پتہ نہیں ایویں کوئی فضول سا بندہ تھا۔ ویسے دوران حبس بے جا میری کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔"(۹)

سارتر کا تصور آزادی بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کے ہونے میں اس کے ارادے کے سوا کسی چیز کا اختیار نہیں۔ یعنی وہ وہی کچھ بنتا ہے جو وہ بننا چاہتا ہے۔ ہونے اور بننے کا دورانیہ جہد و عمل کا وقت کہلاتا ہے۔ یہ روح اور وجود کی استواری اور یکجائی کے نتیجے میں ممکن ہے۔ بعض اوقات پر کامرانی اور کامیابی کے حصول کے لیے عقل و دانائی کا سہارا لیتا ہے اور معروضی دنیا کو ہی کل کائنات سمجھ لیتا ہے ایسے میں وہ روح اور وجود کے تعلق کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا ہے۔ ایسے میں وہ خود کو صدیوں سے قائم مذہبی، سماجی اور معاشی نظام کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ قوت فیصلہ اور قوت ارادی سے مکمل طور پر بے بہرہ ہوتا ہے۔ ایسے میں نہ تو وہ اپنی ذات کا اثبات چاہتا ہے نہ ہی جہد و عمل کی ذمہ داری اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے بلکہ وہ ایک روایتی زندگی گزار کر خود کو موت کے حوالے کر دیتا ہے۔ آزادی اور خود مختاری کا ایسے فرد کی زندگی میں دور دور تک

کوئی عمل دخل نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس کے معنی و مفہوم تک بھی رسائی حاصل ہی نہیں کر سکتا کیوں کہ نامعتبر وجود سائنسی اور عقلی تیز رفتاری میں خود کو گم کر دیتا ہے۔

انسانی چنگل اور انبوہ فرد سے اس کی حقیقی پہچان چھین لیتے ہیں۔ آزادی کا تعلق موضوعی زندگی کی سچائی تسلیم کرنے میں ہے اور سچائی کو عقلی تقاضوں پر نہیں پرکھا جاسکتا۔ اپنے احساس، روح اور وجود کے تعلق سے جس سچائی کو پرکھا جاسکے وہ فیصلہ اور وجود معتبر ہوتے ہیں ڈاکٹر حیات عامر حسینی اس متعلق اپنی کتاب وجودیت میں لکھتے ہیں:

> "بہت سی ایسی باتیں ہیں جو انسان کے لیے بنیادی سچائیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن انہیں نہ تو عقلی استدلال کی بنا پر صحیح ثابت کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ انھیں ان بنیادوں پر قبول کرتا ہے بلکہ یہ اس کے اندرون کا فیصلہ ہوتا ہے ایک ایسا فیصلہ جس میں اس کا پورا وجود شامل ہوتا ہے یہی اندرون کا فیصلہ معتبر (Authentic) ہے۔"(۱۰)

موجودہ مفکرین کے ہاں دو وجودوں کی بات کی جاتی ہے۔ ایک وجود وہ ہے جو صرف ہے۔ شعور و آزادی سے مکمل عاری نامعتبر وجود جبکہ دوسرا وجود ہے نہیں بلکہ ہوگا جو کہ شعور و آزادی سے آگاہ ہے اور ممکنات کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ وجود معتبر موجود کہلاتا ہے۔ افسانہ "مذاق نہ کر یار" بھی ایک ایسے ہی نا معتبر کی کہانی ہے جو کہ تمام عمر شعور و آزادی کے مفہوم سے نابلد رہا ایسا فرد وجود کہلانے کے لائق نہیں بلکہ وہ محض ایک شے ہے جس کے لئے امکان، آزادی اور شعور جیسے الفاظ بے معنی ہیں۔ افسانے میں بھی روح پرواز کے وقت وجود سے گلہ کرتی ہے کہ کس قدر بے کار جسم میں اس کا بسیرا رہا۔ جہاں اس کی ملاقات کبھی فرد کے وجود سے نہ ہو سکی۔ یہ تمام وقت اس نے ایک قید کی طرح گزارا اسے سوچنے سمجھنے کی آزادی نہیں تھی نہ ہی انتخاب اور امکان سے نبرد آزما ہونے کی سکت۔ وہ جسم میں گزارے گئے وقت کو حبس بے جا میں گزرا زمانہ قرار دے دیتی ہے۔ جہاں اس کی ملاقات کبھی وجود سے نہ ہو سکی۔ سید ماجد شاہ اس کیفیت کو مزید بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "پہلی روح نے قدرے غصے سے پوچھا کیوں جی ایسے ہنسنے کا سبب کیا ہے؟ جس میں تو آباد رہی کیا اس سے تیرا یارانہ نہ تھا؟ کیا تم دونوں روح اور مٹی ایک ہو گئے تھے؟"(۱۱)

جسم اور روح کا تعلق ہی خود شناسی کی طرف پہلا قدم ہے اور تمام اشیاء کا ٹھوس نچوڑ انسانی وجود ہے۔ جو وجود اپنی روح سے مل نہیں پاتا اس سے دوستی نہیں کر پاتا وہ تمام عمر نامعتبری کی زندگی گزار دیتا ہے۔ اثبات ذات کے لیے روح اور وجود کا ایک ہونا لازم ہے اس کے بعد ہی موضوعی سچائیوں کا ادارک ہو سکتا ہے جو کہ فرد کی قوت ارادی سے مشروط ہے یہی قوت ارادی ممکنات کے سفر میں فرد کی مدد گار ہوتی ہے اور فرد آزادی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ ایک شے میں عرصہ حیات قید میں گزار کر واپس عالم ارواح میں چلی جاتی ہے اور فرد کی پہچان بس محض ایک شے جیسی رہتی ہے۔

افسانہ "انتہائی گھٹیا آدمی"

افسانہ "انتہائی گھٹیا آدمی" سید ماجد شاہ کے افسانوی مجموعہ "ق" سے لیا گیا ہے۔ افسانے کی کہانی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی ہے جو تماشئیت سے لطف اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ اس کا حق ہے مگر یہ ایک محض نفسیاتی بیماری کے سوا کچھ نہیں افسانہ میں جنسی زندگی کو خوبصورت علامتوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے کہ جنسی آسودگی ہر فرد کی فطرت ہے اور ہر مذہب اور معاشرے میں اس کے ضابطے اور اقدار کا تعین ہوتا ہے ان حدود سے تجاوز کرنے پر ہمیشہ ہی انسان کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ افسانہ "انتہائی گھٹیا آدمی" کا مرکزی کردار ملک عرفان بھی اسی بیماری کا شکار ہے۔ راوی کو ملک عرفان عجیب و غریب حرکات سے گھن آنے لگتی ہے بلکہ وہ اس کا کرایہ دار ہونے کی وجہ سے ایک عجیب خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ یہ کمرہ چھوڑ کر نیا کمرہ تلاش کرنا شروع ہو جاتا ہے ملک عرفان کی کم عمر لڑکے میں دلچسپی اسے عجیب شش و پنج میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مگر وہ آدھا سچ جانتا تھا۔ اس لئے الزام تراشی سے گریزاں ہے۔ وہ زندگی کی اس بے ضابطگی کو کالے کوے کی پھڑ پھڑاہٹ سے تشبیہ دیتا ہے جو کہ ایک نفسیاتی بیماری کی طرح اس کے دماغ میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ اس حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ ملک عرفان اپنی بدصورتی کی وجہ سے زیادہ پڑھ لکھ نہ سکا کیونکہ وہ ہر جگہ اپنے نقوش کی وجہ سے مذاق کا نشانہ بنا رہا ہے۔ پے در پے واقعات نے اسے احساس کمتری کا شکار کر دیا جوانی بھی کسی صحرا کی طرح گزر گئی۔ دنیا سے ٹھکرائے ہوئے شخص نے تماشئیت کے دامن میں تسکین چاہی حقیقت جانے کے بعد صورتحال بجائے غم اور غصے کے کافی مضحکہ خیز تھی۔ اس کے نزدیک ملک عرفان ایک بدھو اور بیوقوف شخص کے سوا کچھ نہ تھا۔ بظاہر تو افسانہ ایک تجسس اور مزاح کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ لیکن درحقیقت یہ معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کا المیہ ہے۔ جو کہ اپنے جذبات و احساسات کی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی راہ تلاش کرتے ہیں۔ یہ بے ضابطگیاں معاشرے میں بے راہ روی کا باعث بنتی ہیں۔ مگر زندگی

سے ٹھکرائے ہوئے لوگ اپنی ذات کی کم مائیگی کا دکھ لے کر کدھر جائیں۔ جو کہ اپنے وجود میں اٹھنے والے سوالات اور احساسات کا جواب تلاش کرنے کی بھی آزادی نہیں رکھتے نہ ہی آپ نے کسی فعل و انتخاب کی ذمہ داری قبول کرنے کی اجازت حاصل کر سکتے ہیں۔

تمام موجودہ مفکرین میں سے اکثر و بیشتر بچپن اور جوانی میں مایوسی اور احساس کمتری کا شکار رہا ہے کچھ اپنی بدصورتی اور کچھ زندگی میں حقیقی رشتوں اور محبت کی کمی سے دوچار رہے۔ آدھے آدمی کی زندگی گزارنا بہت اذیت اور کرب کا معاملہ ہے۔ کرکیگارڈ نطشے اور ژاں پال سارتر باقاعدہ خود ایسی صورتحال سے دوچار ہے ۔اس آدھی ادھوری مخصوص شخصیت کی تشکیل والدین اور معاشرے کا کردار نمایاں ہوتا ہے۔ فرد شروع ہی سے اپنے وجود کو ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے احساس کمتری اور احساس جرم اسے قوت فیصلہ کی طرف بڑھنے سے روکتا ہے اور وہ چاہتے ہوئے بھی معتبر فرد کے طور پر معاشرے کا حصہ نہیں بن سکتا اس صورت حال کو سید ماجد شاہ نے اپنے افسانے میں یوں بیان کیا ہے:

> "بیچارہ اپنے پچکے گالوں اور موٹے ابھرے ہونٹوں اور عینک کی وجہ سے پڑھ نہ سکا۔ سکول کے بچے تو کجا گاؤں کے لونڈے اسے چھیڑتے تھے اس کے احساس کمتری کے قصے سنائے۔ ملک عرفان کی ماں بے چارگی پر اشک بہائے کہ جب بھی وہ اس کا رشتہ لے کر گئی تو اسے کیسی باتیں سننا پڑیں۔"(۱۲)

وجودی مفکرین کے ہاں ایک انتہائی نامعتبر شخص بھی مکمل طور پر وجود سے محروم نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے زندگی کے کسی موڑ پر اس کے داخلی رجحانات اتنے طاقتور ہو جائیں کہ اسے فیصلہ کرنے کے قابل بنا دیں۔ اور وہ اپنے معتبر وجود کو دریافت کرنے کی کوشش کر سکے کیونکہ مسلسل اضطراب اور تشویش سے انسان کے اندر کئی سوالات کو جنم دیتا ہے یہ مسائل عقلی نہیں بلکہ وجودی ہیں وجود اکیلا بھی کچھ نہیں ہے اور دنیا سے بھی الگ نہیں رہ سکتا ہے۔ اس کا دنیا کے ساتھ تعلق ضروری ہے اور سماج کے ساتھ تعلق بنانے کے ذریعے ہیں ایک جنسی خواہش اور دوسری اظہار۔ یہ دونوں خصوصیات ہونے سے فرد کی تکمیل ممکن ہے مگر جنسی خواہشات کا تقاضہ دوسرا جسم یا صنف مخالف ہے جو اتنا ہی ضروری ہے جتنا اس کا وجود مخالف جنس کی طرف یہ کشش تو ایک فطری رجحان ہے مگر ایک ٹھکرایا ہوا شخص جب وجود کی جنسی طلب سے بیزار ہوتا ہے تو جذبات کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے ایسے میں وہ خود کو انبوہ کے حوالے کر دیتا

ہے یہ بے چہرہ قوت فرد کی پہچان پر کئی سوالات اٹھا دیتی ہے انبوہ ایک جھوٹ اور دھوکا ہے اصل سچائی تو آزادی ہے۔ یہاں اگر وجودی تحلیل نفسی کے فلسفے کے تناظر میں دیکھا جائے تو فرد خود اپنی خوشی سے زبردستی کسی دوسرے کے جسم کو اپنی تسکین نہ معروض کی حیثیت سے استعمال کر رہا ہے تو ہر دو صورتوں میں اس کے معنی یہی ہے کہ یہ دوسرے کے وجود کی آزادی پر قبضہ کرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی اپنے مضمون وجودی تحلیل نفسی میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "وجودی تحلیل نفسی ہمارے سماجی اور اخلاقی تقاضوں اور معیاروں کی نفی کرتی ہے۔ وہ زندگی کی بنیادی قدروں جن پر انسان معاشرے کی بنیاد ہے وہ انسان کو اپنی بنیادی فطرت میں ایک سماجی اور باہمی ہمدردی کے جذبے سے منصف ماننے کی بجائے ایسے فرد کے طور پر پیش کرتی ہے جو دوسروں کی قربت اور نظروں سے خائف ہے۔"(۱۳)

افسانہ "انتہائی گھٹیا شخص" بھی ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جو زمانے سے ٹھکرایا ہوا ہے اور اپنے آسودگی اور تسکین کے لیے محبوب کی کشائش پیدا کرتا ہے۔ جو زمانے کی نظر میں تو ایک قبیح فعل ہے مگر اس کے لیے باعث تسکین ہے۔ وہ اپنی زندگی کی کمیوں اور بیزاریوں کو ختم کرنے کی کوشش میں ہے شاید وہ انبوہ سے نکل کر آزادی کی راہ پر گامزن ہو سکے اور معاشرے کا معتبر فرد بن سکے۔ افسانہ ایک مثبت اور رجائی فکر لئے اپنے اختتام کو پہنچا مگر معاشی جبر کے شکار شخص کو سماج میں کیسے مقام مل سکتا ہے یا وہ کس طرح معاشرے کا کارآمد اور معتبر فرد بن سکتا ہے؟ یہ سوال ابھی بھی باقی ہے۔

افسانہ "مذاق"

افسانہ "مذاق" "کتاب "ق" کا حصہ ہے۔ جس میں شیطان اور عورت کو ابن آدم کے مقابل رکھا گیا ہے۔ ابن آدم اس کی عورت اور شیطان تینوں ایک ہی مثلث کے زاویے تھے۔ افسانہ آدم کی مٹی سے پیدائش، ابلیس کا انکار سجدہ، آدم کا جنت سے نکلنا، کامیابی عطا الٰہی میں ہے، جنت اور جہنم میں جانے کی آزمائش یعنی فرد سجود ملائک ہو کر متنازعہ ہوا۔ مٹی کی پیدائش ہو کر نور اور آگ سے سجدہ کروانے کی آزمائش، اشرف المخلوقات ہونا، اس کے اقدار اور بقا کی دائمی جنگ تھی اسے عورت اور شیطان کے ساتھ زمین پر اتار دیا گیا عورت کی رعنائیاں اسے وہ حرارت بخشتی کے جہنم کی آگ سرد لگنے لگتی اور دوسری طرف شیطان اور ایسے حیلے بہانوں سے بہلاتا رہتا ہے۔ وہ مسلسل کشمکش کی کیفیت سے اکتا چکا ہے۔ ایک طرف عورت کی دلفریبی

اسے اکساتی ہے تو دوسری طرف شیطان کے بہکاوے۔۔۔ بیماریاں، پریشانیاں گناہ کی صورت میں سانپوں اور بچھوؤں سے بھرا ہوا آگ کا کنواں کسی ڈراؤنے خواب کی طرح اسے ہراساں کرتا رہتا ہے۔ ابن آدم کا یہ دکھ انفرادی سے اجتماعی ہوتا چلا جارہا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی اولاد کا انجام بھی ہے اس نے اس مثلث کو توڑنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا کیونکہ دوسرے دو زاویہ بہت مضبوط تھے۔ سو اس نے مثلث کے آخری زاویے یعنی اپنے وجود پر غور و فکر شروع کر دی اور آخر کو فیصلہ کیا آدم کے پیکر میں گوتم کی روح رکھ کر اس نے فطرت کے اصولوں سے بغاوت کر دی۔ افسانہ "مذاق" پوری انسانی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ افسانہ فرد کے کائناتی جبر میں مبتلا ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے۔ یعنی ایک لایعنی دنیا میں اس کے وجود کو بیک وقت کئی ایک امکانات سے نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔ اشرف المخلوقات اور معتبر ہونے کی ذمہ داری اس کے ناتواں کندھوں پر ڈال کر عورت اور شیطان کے ساتھ اسے دنیا میں رہنے پر بھیج دیا گیا۔ یہ مثلثی زاویے دن بدن متنازعہ ہوتے جا رہے ہیں۔ بقا اور اقتدار کی اس جنگ میں فرد مسلسل آزمائش اور نئے بیانات سے نبرد آزما ہے۔ مثلث کے دونوں میں مضبوط زاویوں کا خوف اسے ہر وقت ستاتا رہتا ہے۔ عورت کی دلکشی اور خود سپردگی سے بچتا ہے تو شیطان کے حربے اور وار میں پھنسنے کا ڈر طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اس کشمکش سے آزاد ہونے کی سوچتا ہے افسانہ نگار نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

> "میری کشمکش بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی ہے کہ میں نے اس مثلث کو توڑنے کا منصوبہ بنانا چاہا ہے۔ اپنے دشمن کو مات دینے کے کئی طریقے سوچے لیکن بہت زیادہ غور و خوض کے بعد میں نے مثلث کے دو زاویوں کو بہت ہی مضبوط پایا شیطان چھپا ہوا نہ نظر آنے والا دشمن جو جنت جیسے مضبوط قلعے میں ہمیں شکست دے کر اپنی دھاک بٹھا چکا تھا۔ مثلث کا دوسرا زاویہ یعنی میری عورت جو بظاہر کانچ سے نازک ہے مگر میرا غیظ و غضب اور سختی تکبر لطافت میں بدل جاتی ہے۔"(۱۴)

کائناتی جبر کا شکار فرد انفرادی آزادی کی جدوجہد میں سرگرداں نظر آتا ہے لیکن وہ داخلی حدود سے آگے نہیں جا سکتا کوئی ماورائی طاقت اسے یہ دائرہ توڑنے سے روکتی ہے اور وہ طاقت ہے خدا کا وجود اگر پوری کائنات کا سرسری جائزہ لیا جائے تو بنی نوح انسان پر سب سے زیادہ ذمہ داری ہے اس پیدائشی ذمہ داری سے فرار پانے کے لئے چند وجودی فلاسفروں نے ملحدانہ روش اختیار کر لی وہ اس زندگی کو لغو سمجھنے لگے اور خدا کے

وجود سے انکاری ہوئے۔ مگر دیگر الہیاتی وجودی مفکرین نے ماورائی طاقت خدا سے رجوع کیا اور مزید مضبوطی اور تقویت حاصل کی۔ لیکن ابن آدم کائنات کے مضبوط ستون کی حیثیت سے بھی ذمہ داری کا جبر سہ رہا ہے اس لحاظ سے وہ صرف اپنے وجود کا ذمہ دار نہیں بلکہ اپنی نسل کا بھی ذمہ دار ہے۔ یعنی وہ اپنے وجود کی تشکیل کے ساتھ ساتھ نسل انسانی کی تشکیل کا بھی ذمہ دار ہے۔ لیکن اکثر وہ زندگی کے اس بار گراں سے عاجز آ جاتا ہے اور فرار کی راہ چاہتا ہے۔ ایسی زندگی جس میں وہ مکمل آزاد ہو جہاں نہ مذہب کا خوف ہو، نہ عورت کے سحر میں کھونے کا ڈر، نہ شیطان کے بہکاوے کی تشویش اور نہ ہی جنت و جہنم کے فلسفے ہوں۔ وہ دائمی اقتدار اور بقا کی جنگ سے آزاد ایک پر سکون دنیا چاہتا ہے جہاں وہ اپنے جذب دروں کے ساتھ فیصلے و انتخاب کے لیے آزاد ہو۔ دراصل وہ کائناتی جبر سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر افتخار بیگ لکھتے ہیں:

> "روح حیات پر چھایا یہ جمود دراصل صورتحال اور واقعیت کے ساتھ اقدار کا جمود بھی ہے فرد اس جمود کو کسی بھی طور پر قبول نہیں کر سکتا۔ حالانکہ محدودیت بھی اس کے آڑے آ جاتی ہے۔ مگر وہ شکست و کامرانی سے بے نیاز ہو کر جوش و عمل اور جدوجہد پر یقین رکھتا ہے۔"(۱۵)

سید ماجد شاہ کے افسانے میں بھی فرد کی اسی کیفیت کا اظہار ہے۔ وہ فطرت کے بنائے ہوئے نظام سے بغاوت کر کے اپنی ذات کی تحصیل و تکمیل چاہتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اپنی ذات کو کیسے ثابت کرنا ہے وہ اپنے وجود کی وضاحت کے لئے سبھی فطری مسائل اور امکانات سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ وہ مشکلات کو رد کرنا چاہے بھی تو ذمہ داری سے فرار حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ مضبوط مثلثی زاویوں میں بنا ہوا ہے۔ وہ مشکلات اور امکانات سے مسرت کشید کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ آخر کار وہ درپیش صورتحال سے تھک کر مثلث کے آخری زاویے یعنی اپنے وجود پر غور و فکر کرتا ہے۔ یہ دیوار سب سے کمزور محسوس ہوئی اسے طویل اور تھکا دینے والی کشمکش کے بعد آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ کیوں اس فطری جبر کو سہنے پر مجبور ہے۔ لہذا اس نے رہبانیت کی راہ اختیار کی اور ایک پیپل کے درخت کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کی عورت تادیر محو رقص رہی آخر تھک کے گر گئی۔ شیطان کے سب وار اور حربے رائیگاں گئے۔ فرد کے اس فعل نے اسے سکون دیا اس دوران اس نے یہ سوچنا بھی ترک کر دیا کہ فرشتے، عورت اور شیطان اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں لیکن اس سارے تماشے میں اسے شیطان بہت بے تاب نظر آیا جس نے اس کے اس فعل کو بے

ایمانی قرار دیا کہ آدم کے پیکر میں گوتم کی روح رکھ کر مقابلہ کرنا نہ صرف اصولوں کے خلاف ہے بلکہ یہ سراسر مذاق ہے۔

بعض اوقات فرد کو جب یہ محسوس ہوتا ہے کہ مذہب کی اصل روح اور احساس کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے اور مذہبیت اپنی روح سے محروم ہو کر اپنی کشش کھو چکی ہے تو وہ رفتہ رفتہ مذہبی اور اخلاقی اقدار سے نالاں ہو جاتا ہے۔ وہ صدیوں سے بنائے گئے دائروں کو توڑ کر آزادانہ جینا چاہتا ہے۔ عقیدے کے انحطاط نے فرد کو نا صرف انفرادی بلکہ اجتماعی طور پر شدید متاثر کیا۔ لیکن ہر بات طے ہے کہ ماورائی طاقت کے فیصلوں پر سب بے بس ہیں۔ اس افسانے کا اختتام بھی یہی دکھاتا ہے کہ خدا قادر المطلق ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے اس نے جب دیکھا کہ فرد عورت اور شیطان سے نفس کی جنگ لڑ کر تھک گیا ہے تو اس نے ایک نیا روپ اتارا جو ہم گوتم کی صورت میں دیکھتے ہیں یہی شیطان کی ہار تھی۔ جس پر وہ ملول اور پریشان دکھائی دیتا ہے دوسری طرف اگر بدھ ازم کی طرف نظر دوڑائی جائے تو فلسفہ وجودیت اور بدھ مت کا موضوع ایک جیسا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی عالم میں ہر طرف دکھ ہے۔ جس سے فرار ممکن نہیں دکھ سے آزادی کی خواہش نے سارا فساد برپا کر رکھا ہے۔ دکھ سے نجات تو ممکن نہیں اس لیے حقائق کو تسلیم کرنے میں ہی عافیت ہے دونوں ہی فلسفے دور انحطاط کی پیداوار ہیں۔ اس لئے دونوں ہی فرد کی آزادی، خود مختاری اور آزادانہ انتخاب کی بات کرتے ہیں۔

افسانہ "بادلوں کا گچھا"

افسانہ "بادلوں کا گچھا" سید ماجد شاہ کے افسانوی مجموعے "ق" سے لیا گیا ہے۔ افسانہ نیم علامتی انداز لیے ہوئے ہے۔ افسانے کا موضوع اور کہانی ماضی پرستی اور تقسیم کا دکھ لیے ہوئے ہے۔ جہاں مذہب، علاقوں اور زبانوں کی تقسیم زندگی کو نئی نئی تہذیبوں سے روشناس کرواتی ہے۔ وہی شخصی آزادی اور مذہبی پابندیوں کو جنم دیتی ہے۔ افسانہ "بادلوں کا گچھا" بھی ایک ایسی ہی لڑکی کی کہانی ہے جو تقسیم سے پہلے کسی جنت نما دنیا میں رہتی تھی۔ اس کا بچپن اور جوانی وہ نیم وا آنکھوں سے ماضی کی دھندلی تصویروں کو دیکھتی ہے۔ رابعہ جو ایک مسلمان لڑکی ہے مگر مہندر کے ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی۔ اپنے گھر سے مہندر کا رستہ اسے قدم قدم گن کر یاد تھا۔ اس کی محبت مذہب اور علاقائی سرحدوں سے ماورا تھی۔ یکدم سب بدل گیا مہندر کا گھر اس کے گھر سے بہت دور ہو گیا بلکہ کر دیا گیا۔ زندگی کی فلم رک سی گئی۔ اس فلم کے آخری سین میں وہ مہندر کا خاک آلود مردہ چہرہ دیکھتی ہے پھر ہر منظر دھندلا ہو جاتا ہے۔ زندگی کی فلم چلتی رہی مگر رابعہ کے لیے زندگی کا مفہوم بدل گیا۔ وہ موت سے تو بچ گئی لیکن اس کے لیے اب جینے کا مطلب ماضی پرستی کے سوا کچھ نہ رہا۔ وہ آنکھیں بند کرتی تو

اس کے گرد وہی روشنی پھیل جاتی ہے۔ وہی رقص کرتی زندگی سفید اجلے مناظر والا گاؤں اپنے گھر سے مہندر کی بستی تک کے سبھی رستے، دلکش مناظر اور سامنے مسکراتا ہوا مہندر جو اسے "بادلوں کا گچھا" کہہ کر چھڑتا ہے۔

افسانہ شخصی آزادی کا گہرا تاثر لیے ہوئے ہے۔ جس میں فرد مذہبی، سماجی اور سرحدی پابندیوں میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک رابعہ اور مہندر کی کہانی نہیں بلکہ اس وسیع دنیا میں موجود ایسے لاکھوں لوگوں کا دکھ ہے۔ جو محبت جیسے لازوال جذبوں میں بندھ جاتے ہیں۔ یہ جانے بنا کہ انجام کیا ہو گا یا وہ کن اخلاقی اقدار اور روایات کا حصہ ہیں۔ جنگ ہو یا امن ایسی کہانیوں کا اختتام ہمیشہ المیہ پر ہی ہوا ہے۔ جنگیں، اضطراب، انقلاب، تقسیم اور نامساعد حالات جہاں فرد کو بے یقینی کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ وہی اس کے موضوعی جذبوں اور تعلقات سے دوری کا سبب بھی بنتے ہیں اسی کیفیت کو سید ماجد شاہ نے افسانے میں کچھ یوں بیان کیا ہے۔ اقتباس ملاحضہ ہو:

"کل شام بلا کارن پڑا۔۔۔ رات کا وقت۔۔۔ غیر ملکی فوجی۔۔۔
مسلمانوں کی لڑکی رابعہ۔۔۔ چھینا جھپٹی۔۔۔ ٹینک گولے۔۔۔
مسلمانوں کی ماں۔۔۔ ان کی بہنیں۔۔۔ شراب۔۔۔
سسکیاں۔۔۔ اذیت۔۔۔ رابعہ نے موت کے بوجھ تلے سے نکلنے کی
آخری کوشش کی مگر فلم رک گئی۔۔۔ یا شاید ختم ہو گی۔"(۱۶)

اگر افسانے کو فلسفہ وجودیت کے تناظر میں دیکھیں تو یہ فلسفہ عظیم جنگوں کے زیر اثر جنم لینے والے سیاسی معاشی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی بحران کا نتیجہ ہے۔ لوگوں نے اپنی دولت اور رشتے کھو دیے اور جنگوں کے اختتام پر اجتماعی موت اور خوف کے سوا کچھ نہ تھا۔ فرد انفرادی طور پر تنہا اور خوفزدہ تھا مذہب اور اخلاقی اقدار کے بت بھی پاش پاش ہوئے۔ اپنے وجود کے سوا کوئی شے نہ تھی جو قابل اعتبار ہوتی۔ چنانچہ فرد نے اپنی داخلی بصیرت اور وجود کے یقین سے دوبارہ سے حیات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی۔ افسانہ "بادلوں کا گچھا" بھی ایسی کیفیات کا بیانیہ ہے جس میں جنگی صورتحال نے فرد کی آزادی کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ وجودیت اور رومانیت میں مماثلت کی ایک وجہ ماضی سے رشتہ ہے۔ وجودی عناصر میں رومانیت سمائی ہوئی ہے۔ فرد کسی صورت اپنا تعلق ماضی سے نہیں توڑ سکتا وہ ماضی کی سنہری یادوں کو یاد کر کے اپنے موجود کو خوبصورت بناتا ہے یا موجودہ صورتحال کی تلخیوں سے تنگ آ کر فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔ سید ماجد شاہ کے افسانے کا

مرکزی کردار رابعہ بھی جنگ سے پہلے کے دنوں کو یاد کر اپنی زندگی کو محسوس کرتی ہے۔ وجودی اپنی آزادی پر کوئی قدغن برداشت نہیں کرتے۔ جس کا اظہار جمیل احمد مجبیٰ اپنی کتاب میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں ایک واقعہ یا حادثہ کے طور پر
وجود میں آیا ہے لہذا اسے اپنی راہ خود متعین کرنی ہے۔ یہی وہ مکتبہ ہے
جہاں انسانی آزادی کا تصور جنم لیتا ہے اور پیدائشی حق تسلیم کرتے
ہیں۔"(۱۷)

خارجی جبریت کو تسلیم نہ کرنا اور باطن کی آواز اور من کے سوالوں کو اہمیت دینا ہے شخصی آزادی ہے۔ ایسے لوگ معاشرتی جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ مذہب اور اخلاقی اقدار سے نالاں ہو کر جذب دوراں سے واسطہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ آزادی اتنی ہمہ گیر ہے کہ انسان آزاد رہنے کی سزا بھگتتا ہے۔ وہ آزاد رہنے کا پابند ہے مگر ایسی کیفیات عقلی اور معروضی دنیا کے لئے قابل قبول نہیں ہوتی ہیں۔ جس کے لیے فرد اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور سزا بھی پاتا ہے۔ یوں فرد وقت اور حالات سے نبرد آزما ہو کر تاریکیوں سے لڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ انفرادی آزادی کا حصول اقدار سے بغاوت، مذہبی اصولوں سے نالاں ہونا، فرد کا ذاتی انتخاب ہوتا ہے جو کہ ایک دشوار رستہ ہے۔ بغاوت کو تو پھر بھی برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن مذہبی باغی کو اپنے کیے کی سزا ضرور ملتی ہے۔ افسانہ بھی ایسے ہی فرد کی کہانی ہے جو شخصی آزادی کی جدوجہد میں تقسیم کے کرب سے گزرا۔ بھلے عقلی اور تجریدی دنیا کے ضابطے اور قوانین، معاشرے کی بقا اور امن کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ مگر کسی بھی فرد کے وجودی سوالات اور اس کے موضوعی احساسات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے جذب دروں اور داخلی رویوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے وجودی تقاضا ہے کہ فرد معاشرتی جبر سے آزاد زندگی گزارے۔ بقول وزیر آغا اس فرد کی حالت ایسی ہے:

وہیں رہ نوردی، وہی روسیاہی
وہی اک مسافر کہ ضد یہ اڑا ہے

فرد کی اسی ضد اور کوشش کو کامیو اپنی کتاب The Rebel میں انسانی عزم و حوصلے کی اساس قرار دیتا ہے جس کی بدولت کو ایک نیا جہان تخلیق کرتا ہے۔ یہی جدوجہد جذبہ حریت کی طرف پہلا قدم ہے۔ سید ماجد شاہ کا افسانہ "بادلوں کا گچھا" بھی ایسی ہی اضطرابی کیفیت سے جنم لینے والی صورتحال کا عکس لئے ہوئے

ہے۔ افسانہ شخصی آزادی اور مذہبی اقدار سے بغاوت کے نتائج، سزا، جنگ، تقسیم کا دکھ اور ماضی کی خوشگوار یادوں سے روشن ہونے والے چراغوں سے زندگی کشید کرنے جیسے احساسات پر مشتمل ہے۔

افسانہ "ق"

یہ افسانہ افسانوی مجموعے "ق" سے انتخاب کیا گیا ہے۔ کتاب کا نام اس افسانے کے موضوع مستعار لیا گیا ہے۔ "ق" ایک علامت ہے جس میں آنکھیں ہمیشہ دماغ سے اوپر رکھی جاتی ہیں یعنی ہم محض آنکھوں دیکھے پر فیصلہ سنانے کے عادی ہیں۔ کبھی دماغ سے سوچنے کی زحمت نہیں کرتے افسانہ "ق" کی کہانی مرد و عورت کے تعلق اور اس کی استواریت کے طریقے پر مبنی ہے مرد عورت سے کہتا ہے تم میرے اخلاق کی حفاظت کر سکتی ہے ورنہ میرے گمراہ ہونے کا خدشہ ہے جس پر وہ برہم ہوتی ہے کہ اپنی حفاظت خود کرنا سیکھو۔ وہ اسے پیار سے اپنے عقد میں لانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اس کے سبھی شرعی سماجی دلائل کو رد کر دیتی ہے۔

وہ اس وہ اس کے سبھی بیان اخلاق اس کے سبھی ق حروف یعنی اخلاق، قلعہ کی قلماقنی، عقد، حق، تعلق کو رد کرتی ہے اور اسے اپنی غلامی تصور کرتی ہے۔ وہ اس قید کو قبول کرنے سے انکاری ہے مرد اسے بتاتا ہے کہ یہ قانون فطرت ہے لیکن عورت اسے بھی قابو کرنے کا حربہ کہہ کر انکاری ہے آخر بات مار پیٹ اور لڑائی تک آجاتی ہے قاف کی پری اور قمروش کی جگہ قحبہ، قطامہ اور قلتین جیسے حروف لے لیتے ہیں آخر کار فطری تقاضے کے مطابق عورت کو ہی ہار ماننی پڑی۔ عقد ہو گیا اور اب وہی عورت مرد کا ہر حکم ماننے کے لیے تیار ہے۔ یا شاید شریعت اور قانون کی رو سے مجبور ہے۔ ق کی تکرار اول تا آخر افسانے میں جاری رہی جو کہ اس کی دلکشی کو مزید نکھار دیتی ہے۔ انسانی رویوں کے اتار چڑھاؤ اور بدلاؤ کو خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے افسانہ شخصی آزادی، سماجی نظام کی پیروی سمیت وجودی تحلیل نفسی کے موضوعات کو زیر بحث لاتا ہے۔

ہم راوایتی نظاموں میں جکڑے ہوتے ہیں۔ جن کی پیروی کرنا ہم سب پر فرض ہوتی ہے ورنہ ہم معاشرے میں باغی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وقت کا یہ جبر فرد کے لئے کرب کا باعث بنتا ہے۔ اس کی ساری جدوجہد بے معنی ٹھہرتی ہے۔ وہ زندگی کے لیے نئے امکانات سے لڑنے میں خوف محسوس کرتا ہے اور اس میں ہمیشہ ایک لاحاصلی کا شکار ہوتا۔ فرد خود کو کبھی بھی سماجی روایات اور مذہبی اور اخلاقی اقدار کے آئینے میں شفاف اور واضح نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ہمیشہ سے آزادی کا خواہاں رہا ہے۔ ایسے ہی سماجی جبر کا عکس سید ماجد شاہ نے "ق" میں کچھ یوں پیش کیا ہے۔ مرد و عورت کی بحث کا ایک منظر:

"مرد کلاشنکوف اٹھا کر فیصلہ چاہتے ہوئے: اے لڑکی! حقیقت کو سمجھ اور
بول عقد کرے گی؟ بنے گی قلماقنی؟
لڑکی: مت کہو قلماقنی۔ ان باتوں میں کوئی حقیقت نہیں تم صرف قلبہ
رانی کی خاطر تعلق جوڑتے ہو۔
اٹھاؤ قسم، بتاؤ حقیقت
مرد: اتنی قسادات کا مظاہرہ نہ کر مجھے تیرا تعلق تیرا ساتھ چاہیے۔
لڑکی: تعلق یا غلامی؟"(۱۸)

اقتباس معاشرتی جبر کا عکس لئے ہوئے ہے۔ جہاں مرد کو حاکم قرار دیا گیا ہے۔ جہاں پدر سری نظام میں سارے اختیارات مرد کے ہیں ایک عورت اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ عورت پر اس زبردستی کی ایک وجہ فرسودہ روایات ہیں۔ جس کی رو سے مرد عورت پر حاکم تصور کیا گیا ہے یہی تصورات عورت کو کمزور کرتے ہیں اور اس کا اعتماد کمزور کرتے ہیں۔ یہ سماجی جبر صرف اکیلا مرد یا عورت کی بدولت نہیں بلکہ یہ سارے سماج کی قوتوں اور عمل کا نتیجہ ہے۔

ظلم اور جبر ایک نظام ہے جو کہ نسل در نسل چلا آتا ہے۔ غالب روحانی فرسودہ روایات کو باقاعدہ قانون کی شکل دے دی جاتی ہے۔ اگر اس افسانے کے تناظر میں شخصی آزادی اور معاشرتی جبر کو دیکھا جائے تو یہ عنصر بھی واضح ہوتا ہے کہ پدر سری نظام کو مضبوط کرنے میں عورت کا اپنا بھی غیر معمولی کردار ہے۔ فلسفہ وجودیت سے ہٹ کر اگر ہم شخصی آزادی کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اسلام میں آزادی کا مفہوم یہی ہے کہ انسان اللہ کے سوا ہر اطاعت و بندگی سے مبرا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے نفس کی خواہشات کا غلام بھی نہ رہے تو پھر کوئی دوسرا وجود کیسے اس پر زبردستی مسلط ہو سکتا ہے اور پھر عورت کو اپنا فیصلہ کرنے کا اختیار مذہب نے بھی عطا کیا ہے۔ ہمارے سماج میں بچپن سے لے کر سن شعور تک یہ بات عورت کی گھٹی میں شامل کر دی جاتی ہے کہ اسے دوسروں کے کئے گئے فیصلوں پر سر جھکانا ہے۔ افسانہ "ق" بھی ایسا ہی اختتام لیے ہوئے ہے جس میں آنکھیں دماغ سے اوپر ہیں یعنی بنا سوچے سمجھے آنکھوں کے کہنے پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار صورت حال کو یوں بیان کرتا ہے:

"مرد: میں نے عقد کا کہا تو لگی اول فول بکنے۔ لڑکی: (روتے ہوئے) تجھ
سے عقد؟ قصائی کے کھونٹے سے بکری باندھنا ہے۔۔۔(قصاب کے
کھونٹے سے بکری کو باندھ دیا گیا۔۔۔کچھ عرصے بعد)
لڑکی: عشاء کے بعد جلدی واپس آجائے گا مجھے فکر ہوتی ہے۔۔۔"

وہی لڑکی جو دیر تک عقد کے لئے راضی نہیں ہوتی کوئی سماجی اور شرعی تاویل اس پر اثر نہیں کرتی۔ زور زبردستی سے اس کا نکاح ہو جاتا ہے تو وہ اپنے من کی سبھی خواہشات کو ترک کر کے اس تعلق کو نبھانے پر مجبور ہے معروضی دنیا سے تعلق رکھنے کے لیے فرد کو جن دو چیزوں کی اشد ضرورت ہے وہ اظہار اور جنسی تعلق ہے۔ جنسی زندگی کیسے گزارنی ہے اس کے لیے مذہبی و اخلاقی نظام موجود ہے۔ وجود تحلیل نفسی جو کہ سارتر اور سیگمنڈ فرائیڈ کے افکار کا مجموعہ ہے کے مطابق اس بات کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک وہ عمل ہے جو آپ کو احساس جرم دلائے یعنی کوئی وجود خود بھی اپنے عمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکاری ہو۔ بلکہ دوسرے وجود کو مورود الزام ٹھہرے تو ایسا شخص اپنا ہی مجرم ہے۔ دوسری صورت وجودی جرم ہے یعنی فرد دوسرے کی نظر کا مرکز ہے تو اپنے آپ کو مجرم محسوس کرے اور اپنے فعل کی ذمہ داری قبول کرے۔ انسانی تعلقات میں یہی دو صورتیں پیش نظر ہوتی ہیں یعنی یا دوسرے کی داخلیت کو شکار کیا جاتا ہے یا خود دوسرے وجود کا شکار ہو جاتا ہے۔ وجودی فلاسفروں کے نزدیک فرد محبت اور جنس میں اکثر اپنی آزادی کھو دیتا ہے۔ اس کی خود پسندی اسے اس بات پر قائل کر دی ہے کہ وہ دوسروں کو اپنا معروض سمجھ کر استعمال کرے اور اس کی آزادی اور داخلیت کو شکار کرے۔ تو اس صورت میں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کی اپنی آزادی بھی خطرے میں ہے کیونکہ دوسرے وجود کے حصول میں وہ اپنے وجود کو بھی معروض کے طور پر استعمال کر رہا ہوتا ہے افسانہ نگار نے بھی شخصی آزادی اور تعلقات کی معروضی و موضوعی نوعیت کو خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ "ق" کی علامت اور تکرار نے افسانے کو مزید نکھار دیا ہے۔ افسانہ یہی تاثر دیتا ہے کہ وجودی تحلیل نفسی ہمارے سماجی اور اخلاقی اصولوں اور معیارات کی نفی کرتی ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے سماجی نظام میں فرد کی آزادی اور خود مختاری کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ فرد خود غرضی اور نرگسیت کے حصار میں قید ہے۔ اس لیے وہ تعلقات میں شکی مزاج اور جلد دوسروں کی قربت سے خائف ہے۔ اگر مجبوراً فرد کسی تعلق میں بندھ بھی جائے تو وہ اس کی سماجی مجبوری ہے۔ ایسے میں اس کا وجود انتخاب عمل اور ذمہ داری قبول کرنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔

مختصر افسانہ "دریا کی ایک نہ سننا"

مختصر افسانہ "دریا کی ایک نہ سننا" سید ماجد شاہ کے مختصر افسانے مجموعے "ر" سے لیا گیا ہے۔ افسانہ زندگی کی استواریت اور محدودیت کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ زندگی کا دائرہ کتنا ہی تنگ کیوں نہ ہو جذبہ حریت رکھنے والے وجود اظہار کی راہ ڈھونڈ لیتے ہیں افسانے کی کہانی میں دریا کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جہاں دریا سے مراد فرد ہے یعنی انسان کا وجود جو کہ ہمہ وقت فطرت سے نبرد آزما رہتا ہے فرد اور فطرت کے تصادم سے اپنے وجود کے اثبات سے شروعات کرتا ہے اور شخصی آزادی کو داؤ پر لگا کر فطرت کے امکانات سے لڑتا ہے۔

حیات انسانی ہر دم نئی رسائی کی طلبگار ہے۔ پل پل بدلتے ہوئے حالات و واقعات نے اس کے ارتقائی، اخلاقی، سماجی اور تہذیبی نظام پر بے شمار اثرات مرتب کئے تہذیب و تمدن کے ارتقا میں پیدا ہونے والے افکار و نظریات نے جن نظاموں کو جنم دیا ان کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ درست ہیں تو اس کی تشکیل نو کی جائے اور اگر وہ ٹھوس اور درست حقائق پر مشتمل نہیں تو ان سے نجات حاصل کی جائے کیونکہ موجودہ دور جس کو علم، روشن خیالی اور آسودگی کا سنہرا دور کہا جاتا ہے مگر اس روز افزوں ترقی کے ہوتے ہوئے بھی فرد انفرادی طور پر خوف، بے یقینی، درد اور اضطراب کا شکار ہے۔ وہ علاقائی آزادی تو رکھتا ہے لیکن شخصی آزادی سے محروم ہے وہ مشینی دور کا غلام ہو چکا ہے افسانے میں زندگی کے بہاؤ کو دریا کی روانی سے واضح کیا گیا۔ سید ماجد شاہ نے کس دلکشی سے تہذیب و تمدن کے ارتقا کی وضاحت کی اقتباس ملاحظہ ہو:

> " میں جب چل پڑتا ہوں تو پھر پتہ نہیں کیوں کہ میرے ساتھ ایک جہاں چلتا ہے۔ پھلتا پھولتا ہے۔ فصلیں، درخت، گھاس، جھاڑیاں، چرند پرند، کیڑے مکوڑے ہی نہیں، تہذیبیں پروان چڑھتی ہیں۔ میں رک گیا تو میں نہیں رکوں گا۔ زندگی رک جائے گی۔ میری قربت میں اطمینان سے رہو اپنی درانتیاں اور ہل خود تیز رکھو۔ کلہاڑیاں تیز کر لو اور مجھے بہنے دو۔ "(۲۰)

فرد کا تعلق اپنے وجود کے ساتھ لامحدود ہے فرد جذباتی ہے وہ لمحہ لمحہ اپنی آزادی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس کا انتخاب اور قوت ارادی ہی اسے آزادی کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ زندگی میں اضطراب کی حالت میں بھی فیصلے کرتا ہے۔ یعنی وہ ہر وقت نئے خطرات میں گھر اریتا ہے۔ یوں انفرادی ذمہ داری اس کی

موجودگی کو جکڑے ہوئے ہے۔ لیکن موضوعی زندگی کے منظم فلسفے بھی قدم قدم پر فرد کو متاثر کرتے ہیں۔ دونوں میں توازن رکھنا اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ افسانہ "دریا کی ایک نہ سننا" بھی فرد کے اثبات کے حوالے سے ہے۔ فرد کا وجود اس کائنات میں سب سے اہم ہے۔ کرہ ارض ہر تہذیب کی بنیاد اور اس کی ترقی کی وجہ فرد ہے۔ تہذیب کی بنیاد رکھنے والا فرد اس ارتقا کے عمل میں بارہا فرد کی اپنی شناخت کھو چکا ہے۔ فرد نے اپنے جذب دروں سے ہمت کر کے تمام مسائل پر قابو پالیا۔ وہ بیک وقت جنگ، نفرت، بیماری، بھوک اور بیماری سے برسرپیکار رہا۔ اس کے علاوہ لگے بندھے نظام، جہالت، دقیانوسی اقدار اور اخلاقی قید و بند نے اسے مسلسل خانہ جنگی کے سپرد کیے رکھا۔ موجودہ تہذیبیں اور تمدن کے نظریات فرد کی مسلسل کاوش خطرات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت کے پیش نظر یہ ہم تک پہنچی ہے۔ انسان کی اس تہذیبی تگ و دو اور ارتقائی مراحل سے گزرنے کی تلخیوں کے بارے میں ہمیں سب قنوطی نظریات ہی ملتے ہیں۔ اس کی موضوعیت اور آزادی ہمیشہ خطرات سے دوچار رہی اسے کہیں رجائی نقطہ نظر سے نہیں دیکھا گیا ناہی پذیرائی ملی۔ جس کا نتیجہ یہ بے زاری اور اس طرح کی اضطرابی کیفیت ہے۔ روشن خیالی ٹیکنالوجی کے سنہری دور میں رہتے ہوئے بھی فرد تنہائی اور لایعنیت کا شکار ہے۔ شخصی آزادی کی اس طویل جنگ میں فرد کی حیثیت دریا سے سمٹ کر محض ایک جھیل کی سی رہ گئی ہے۔ سید ماجد شاہ افسانے کے اختتام میں اس افسوسناک صورتحال کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں

> "اپنی موجودہ حالت پر مطمئن رہو ورنہ سب کچھ بدل جائے گا۔ آخر کار پہاڑ نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا پہاڑ سد راہ ہوا تو دریا مٹ گیا اب وہاں جھیل ہے۔ زندگی آج بھی پیکر بن کر ویسے ہی بہہ رہی ہے۔ جیسے کبھی دریا بہتا تھا۔"(۲۱)

وہ تمام صلاحیتیں جو انسان بطور فرد سماج سے حاصل کرتا ہے ثقافت کے زمرے میں آتی ہیں۔ چاہے وہ منظم ہوں یا غیر منظم اس میں شخصی صلاحیتیں، ادارک اور اقدار شامل ہیں۔ یہی فلسفیانہ خیالات، طرز معاشرت، موضوعی اور معروضی زندگی کے تضادات مل کر تہذیب کو جنم دیتے ہیں۔ یہی جہالت اور انسانیت میں تمیز کا پیمانہ ہے۔ خارجی و باطنی فطرت کے ملاپ سے پیدا ہونے والے نظام کو ایک بہترین تہذیب کہا جاتا ہے۔ جس کا مضبوط ستون فرد ہے۔

فرد نے ہر دور میں اپنی ذات کو خطرات میں ڈال کر اپنی شخصی آزادی کو داؤ پر لگا کر تہذیب کی جڑوں کو مضبوط کیا اور اس سب نے اس کی اپنی ہستی کسی دریا سے سکڑتی سکڑتی جھیل برابر رہ گئی ہے۔ ہاں تہذیب آج بھی پیکر بدل کر موجود ہے جیسے دریا کے دور میں تھی۔ لیکن سوال وہی ہے انسانی درد کا مداوا کیا ہے؟ اس کی شخصی اور سماجی آزادی کہاں تک برقرار ہے؟

اس تجریدی و سائنسی دور کے ہوتے ہوئے بھی وہ بیگانگی اور تنہائی کا شکار کیوں ہے؟ یہی وہ موضوعی سوالات ہیں جو فرد کو دوبارہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس صورتحال میں وہ اپنے جہد و عمل سے نیا جہان تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنی کم دامنی اور محدودیت کے دائرے سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے یہی کوشش موضوعیت ہے جو آزادی کے سوا کچھ نہیں۔ ژاں پال سارتر اپنے مضمون "وجودیت اور انسان کی دوستی" اس ضمن میں لکھتا ہے:

> "وجودیت کی تہہ اور مراکز میں جو عناصر کارفرما ہیں۔ وہ آزاد خود عہدی ہے اور آزاد خود عہدی ہمیشہ ایک قابل فہم خود عہدی ہے، جو کسی بھی دور میں کسی سے بھی متعلق ہو سکتی ہے اور اس سے انسان انسانیت کی ایک قسم سے آگاہی پاتا ہے۔ ثقافتی ڈھانچے کی اضافیت پر اثرات کی آگاہی اس قسم کی مطلق خود عہدی کا نتیجہ ہے۔"(۲۲)

افسانہ بھی فرد کی اس خود عہدی اور آزادی کا بیانیہ ہے جو ہر دور میں ثقافتی و تہذیبی ڈھانچے کی مضبوطی کا سبب بنتی ہے ایک آزاد ذات اور وجود بھی تاریخ میں متعین ہونے والی تبدیلیوں کو برداشت کر سکتا ہے اور اپنے انتخاب کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے۔ ہر حالت اور دور میں جاتی آزادی خود عہدی اور اپنے فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنا ہی تمام انسانیت کی خود عہدی ہوتی ہے۔ چاہے اس سفر میں فرد کی ذاتی اور انفرادی حیثیت دریا سے سمٹ کر جھیل ہو جائے مگر زندگی اور تہذیب کا سفر کسی نہ کسی صورت جاری و ساری رہتا ہے۔

افسانہ "تیری کہانی کمزور ہے"

افسانہ "تیری کہانی کمزور ہے" سید ماجد شاہ کے دوسرے افسانوی مجموعہ "ر" سے لیا گیا ہے۔ افسانے کی کہانی ایک ایسے فرد کے گرد گھومتی ہے جو ساری عمر مشکلات میں گزار دیتا ہے تاکہ اپنی اور اپنے اولاد کی زندگی کو آسودہ کر سکے۔ انہیں معاشرے میں معتبر بنا سکے۔ لیکن تمام زندگی کے بعد بھی وہ کوئی مناسب زندگی نہ جی سکا نہ ہی اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے کوئی تگ و دو نہ کر سکا۔ زمانے کی تلخیاں اور بے یقینی نے اسے

اس قدر مجبور کر دیا کہ اسے جب یہ بتایا گیا کہ اس کے مرنے کے بعد ہی اس کے بیٹے کو اس کی جگہ نوکری مل سکتی ہے تو اس میں اپنے دفتر کی عمارت سے کود کر اپنی جان دے دی اس کے پاس اذیت اور کرب سے چھٹکارا لئے آزادی کی ایک ہی راہ بچی تھی تو اس نے وہ قبول کر لی اور خودکشی کی۔ زندگی یوں بھی ایک ادھوری دستاویز ہے۔ عمر بھی فرد بہتر جینے کے لیے ناقابل برداشت لایعنی سفر کاٹتا ہے۔ اس امید پر کہ شاید آنے والا کل بہترین ہو وہ اپنی ادھوری تخلیقات کی تکمیل چاہتا ہے۔ لیکن یوں ہی اسے لگتا ہے کہ فتح کے قریب ہے موت اسے اچانک کہتی یہ ایک اٹل امکان ہے جس سے فرار ممکن نہیں ہے جبری محنت اور زندگی سے اکتایا ہوا اقبال اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتا ہے۔ جس کا تذکرہ سید ماجد شاہ نے افسانے میں یوں کیا ہے:

"لو میں گیا (اقبال کود گیا)

ہاں اب چھت کی بلندی سے پستی کی طرف آ رہا ہیں اب کچھ کہانی شروع ہوئی ہے مان لیا اقبال تجھے مان لیا۔ تو نے کہانی شروع کر دی۔ ہم تجھے پستی کی طرف آتا دیکھ رہے ہیں۔ تو نیچے گر تو مر پھر دیکھتے ہیں تیری کہانی ادب عالیہ کی طرح انجام پر کیا سوال اٹھاتی ہے۔ ویسے سوال تو ہم رزیلوں کے تفص زدہ ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیا اب تو انہیں کے مطابق اس کے بیٹے کو نوکری مل جائے گی؟ کیا اس کا جنازہ پڑھا جا سکتا ہے؟"(۲۳)

یوں تو کہا جاتا ہے کہ موت ہو ٹل حقیقت ہے۔ جو ہماری ساری زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ ہر کوئی اس دن سے ڈرتا ہے جب موت اس سے زندگی اس کی زندگی کو چھین لے۔ لیکن کبھی کبھی ہم موت سے ڈرنے کی بجائے خود اس کی طلب کرتے ہیں۔ جب اذیتیں حد سے بڑھ جاتی ہیں تو ہم موت کی دعا کرتے ہیں یا دوڑ کر خود اس کو گلے لگا لیتے ہیں بقول غالب:

؎ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی

وجودی مفکرین کے نزدیک خاص کر الہادی مفکر ہائیڈیگر کے تصور موت کے مطابق فرد عمر بھر امکانات سے حالت جنگ میں ہوتا ہے۔ موت بھی ایک منفرد اور اٹل امکان ہے جو سب امکانات پر آخری مہر ہے۔ فرد دنیا کے باقی نظاموں کی طرح موت کو بھی ایک نظام سمجھ لیتا ہے یہ موت کا غیر شخصی تصور ہے جس کا موضوعیت سے کوئی تعلق نہیں۔

افسانہ "اقبال تیری کہانی کمزور ہے" میں بھی اقبال کو لگا تھا کہ وہ اپنی زندگی تیاگ کر اپنی اولاد کے لیے آسوگی خرید لے گا مگر ایسا نہ ہوا اولاد کو بہترین تعلیم دی مگر بے روزگاری کے موسم میں اسے نوکری نہ ملی جوان بیٹے کا بے روزگار ہونا والدین کے لیے باعث تکلیف تو ہے ہی سماج میں نامعتبری الگ ہے ایسے میں اقبال کو بتایا گیا کہ اگر وہ دوران ملازمت مر جاتا ہے تو اس کی جگہ اس کے بیٹے کو ملازمت پر رکھ لیا جائے گا وہ آخری حربے کے طور پر اپنے افسر کو منانے کی کوشش کرتا ہے مگر سب بے سود ہوا تو آخر اس نے خود کو زندگی کی قید سے آزاد کرایا اور موت کے حوالے ہو گیا۔ کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی بلکہ شروع ہوئی ہے۔ اب اقبال کے بیٹے کو نوکری مل جائے گی؟ کیا اقبال کا جنازہ پڑھایا جا سکتا ہے؟ کیونکہ وہ حرام موت مرا ہے۔ اس بارے میں بختیار حسین صدیقی اپنے مضمون موت وجودی انسان بہرستوں کی نظر میں لکھتے ہیں:

> "ہائیڈیگر سمجھتا ہے کہ موت ایک منفرد حقیقت ہے کیونکہ وہ ایک شخص، ایک فرد کی موت ہے یہ ایسا کام ہے جو کوئی دوسرا میرے لئے نہیں کر سکتا کیونکہ انسان خود ہی موت سے ملنے کے لیے آگے بڑھتا ہے اس لیے اس آخری امکان کے پورے ہونے سے پیشتر ہی اس کا وجود شخصی ہوتا ہے اور منفرد۔"(۲۴)

لیکن موت کا یہی نظریہ سارتر کے ہاں جا کر منفرد صورتحال اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے نزدیک سراسر لغو اور خارجی امکان ہے مگر یہ اپنی تمام لایعنیت کے ساتھ فرد کے وجود پر ظاہر ہوتی ہے اور اسے تمام حدود و قیود سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیتی ہے۔ زندگی کی محدودیت سب پر عیاں ہے اور موت اس میں محدودیت پر آخری مہر لگا دیتی ہے۔ اقبال کی کہانی بھی ایسے ہی شخص کی کہانی ہے جیسے عمر بھر محدودیت کا سامنا رہا آخر کار اس محدود زندگی اور نامعتبری کے خوف سے آزاد ہونے کے لیے اس نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اپنے وجود کو لایعنیت سے آزادی دینے کے لیے اس نے آخری امکان موت کو چنا۔ لیکن کیا اس کی اس قربانی کا فائدہ اس کی ذات کو ہو گا یا وہ اجتماعی آزادی جس کے لیے اس نے شخصی آزادی کو قربان کیا وہ میسر آئے گی یہ سوال ابھی باقی ہے؟

افسانہ "پیوند"

افسانہ "پیوند" سید ماجد شاہ کے افسانوی مجموعے "ق" سے لیا گیا ہے۔ پیوند جنسی موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے جس کی کہانی معاشرے کے دو معتبر اور مقدس رشتوں میں جنس کی غلط پیوندکاری پر مبنی ہے جو

موجودہ دور میں آزادی کے تصور کی جاتی ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ آزادی نہیں بلکہ انبوہ ہے۔ کہانی باپ بیٹی کی ہے جو کسی بہکاوے میں غلط راستے پر نکل جاتے ہیں لیکن ضمیر جاگتا ہے گناہ کے بعد فساد برپا ہو جاتا ہے۔ بیٹی باپ سے مسلسل الجھتی ہے کہ جو ہوا غلط ہوا۔ پہلے پہل وہاں سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ تجربہ سمجھو مگر وہ اسے مشرقی زمین پر شجر ممنوع کہہ کر رد کر دیتی ہے۔ وہ اسے ہوس قرار دیتی ہے اور اس گناہ کا ازالہ چاہتی ہے۔ لیکن کیا ازالہ ممکن ہے؟ باپ کا صبر جاتا رہا وہ چیخ اٹھتا ہے کہ یہ بیج بوتے ہوئے تجھے حیا کا پاس نہ تھا اب بغاوت کرتی ہو کیا تم نے کوئی نیا باپ تلاش کر لیا ہے۔ گو کے افسانے کا موضوع اور کہانی ہمارے اس منافقانہ معاشرے سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ اگر ایسے واقعات ہوتے بھی ہیں تو انہیں قبیح جرم سمجھا جاتا ہے۔ ان پر بات کرنا جرم اور باعث شرم سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جنسی موضوعات پر بات کرنا عار سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ان پر سنجیدگی سے گفتگو کرنے اور باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہے۔ تاکہ ایسے گناہوں سے روکا جا سکے۔ جدیدیت کی ہوا اور شہری انبوہ نے انسان کو مشینوں کے جنگل میں چھوڑ دیا ہے جہاں وہ اچھے برے کی تمیز سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا ہے اگر اسے یہ خیال آتا بھی ہے تو بہت دیر بعد۔۔۔ افسانہ "پیوند" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ہوس کی خاردار جھاڑی پر محبت کے لطیف ٹہنی کی پیوند کاری کیوں کی آپ نے؟ ایسا نہیں ہوتا ہے کیا؟ سب کچھ اپنے مکس اپ کر دیا۔ باغ کا باغ اجاڑ دیا آپ نے۔۔۔۔ وہ اچانک باپ پر برس پڑی۔"(۲۵)

مصنف نے جنس کے موضوع پر قلم اٹھایا لیکن حظ اٹھانے یا لذت کشید کرنا مقصود نہیں اصل نقطہ حدود کو پھلانگنے اور آزادی و انبوہ کے فرق کو سمجھانا مقصود تھا۔ قلم کی معمولی سی لغزش لکھاری کی نیک نامی کے لیے خطرہ بن سکتی تھی لیکن سید ماجد شاہ نے اسے درست سمت عطا کی۔ وجودی مفکرین کے نزدیک آدمی کے اعمال اس کے جسم (وجود) سے وابستہ ہیں۔ اگر معاملہ جنس کا ہو تو پہلا فرد دوسرے کے وجود کو بطور آلہ (شے) استعمال کرتا ہے اور سماج کی تعمیر میں جنسی خواہش اور اظہار بنیادی ضروریات ہیں۔ یہ جنسی خواہشات انسانی وجود کے تقدس کے عین مطابق ہونی چاہیے ورنہ یہ جذبات نرے شیطانی ہیں۔ محض شے ہونا اور اپنے معیار کو گرانا اپنی آزادی کے قدغن لگانے کے مترادف ہے۔ اگر کوئی فرد جنس کی غلط پیوند کاری کرتا ہے تو اس نے خود کو بیگانہ کر دیا ہے وہ انبوہ کا شکار ہے۔

یہ ہر گز شخصی یا وجودی آزادی نہیں ہے افسانہ "پیوند" بھی ہمیں حقیقی معنوں میں آزادی اور انبوہ میں فرق سمجھانے کی ایک کاوش ہے۔ وجودی نقطہ نظر میں انبوہ اور آزادی میں طرفین کا فرق ہے۔ یہ دو سیدھی لکیریں ہیں جو ایک دوسرے کے مخالف چلتی ہیں یہ بے چہرہ نہ معلوم ہوتے ہیں جو فرد کو غلط انتخاب پر مجبور کرتی ہیں۔ جس سے اس کا اعتماد، روح اور وجود نقصان اٹھاتا ہے یہ فرد سے اس کی حقیقی آزادی اور ذمہ داری چھین کر اسے لایعنی دنیا میں دھکیل دیتا ہے۔ کارل جیسپرز نے اسے انبوہ(Mass Existance) کا نام دیا ہے کچھ کے نزدیک یہ IT(یہ) ہے۔ جو I(میں) کو IT(یہ) یعنی شے میں تبدیل کرتا ہے۔ وجودی تعلقات نہایت حساس اور پیچیدہ ہیں۔ جو ذرا سی غفلت اور لاپرواہی سے انبوہ میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ افسانہ پیوند میں مقدس تعلق انبوہ کا شکار ہو کر معتبر ہو کر شخصی وقار کھو دیتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "عین باغ کے وسط میں۔۔ یہ جھاڑیاں یہ پیوند کاری کے کڑوے کسیلے پھل۔۔ کہا نا مجھے پھولوں اور پھلوں سے ابکائی آتی ہے آپ کو بھی آتی ہو گی۔ اگر نہیں بھی آتی تو آپ اس خوشبو اور پھل کا تذکرہ سرعام کر سکتے ہیں۔۔۔؟"(۲۶)

انبوہ فرد سے وہ گناہ کرواتا ہے۔ جن کا تذکرہ وہ سماج کے سامنے کرنے سے گھبراتا ہے اور اگر یہ موضوعات معاشرے کے سامنے آ بھی جائے تو سب کے سامنے توہین اور ذلت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ انبوہ معاشرے میں دو طرح کے افراد پیدا کرتا ہے۔ ایک وہ شخص جو اپنی آزادی اور قوت فیصلہ کھو دے۔ جیسے کہ افسانہ پیوند میں بیٹی کا کردار ہے۔ جبکہ دوسرا وہ ظالم شخص جو انبوہ جیسی ظالم طاقت سے قوت لے کر جبر کی روش اختیار کر لیتا ہے۔ جس میں نطشے کی تصور کی روح ملتی ہے۔ اس ضمن میں قاضی جاوید اپنی کتاب وجودیت میں لکھتے ہیں:

> "یہ سب انبوہ کی مسرت، تحفظ، آسائش اور تمام انسانوں کے لیے زندگی کے لیے ایسا موقع سہولتوں اور خوشیوں کے آرزومند ہیں۔ وہ سب عدمیت کی راہ استعمال کرنا چاہتے ہیں ان کے نزدیک فرد نہیں انبوہ اہم ہے۔"(۲۷)

معاشرے کے افراد زندگی کی نزاکتوں اور رنگینیوں کا گلا گھونٹ کر انسانیت کا وجود زندگی کا حسن مجروح کر دیتے ہیں اور پھر اس سنگین جرم کو شخصی آزادی سے جوڑ دیتے ہیں۔ موجودہ معاشرے میں ہمیں ایسی

ہی صورتحال کا سامنا ہے جس کے نتیجے میں فرد شدید محرومی میں بے اعتمادی اور تنہائی کا شکار ہے۔ اور نام نہاد آزادی کے کھوکھلے نعرے لگا کر فرد کو گمراہ کیا جارہا ہے۔ شخصی جرائم میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ وجودی تعلقات کا تقدس پامال ہوتا جارہا ہے۔ انسان عدم شناخت اور روحانی بحران کا شکار ہے۔ جس کے نتیجے میں بے لگام صنعتی تہذیب نے جنم لیا ہے۔ اس جدید تہذیب اور انبوہ نے انسان کی شخصیت تصورات اور احساسات کو چھین کر اسے بے راہ روی کا شکار کر دیا ہے۔ تنہائی اجنبیت اور کھوکھلے دعوے اور نعرے فرد کی شخصیت کی نفی ہے۔ افسانہ "پیوند" بھی ایسے ہی احساسات کا بیانیہ ہے جس میں فرد سے اس کی علامتیں اور احساسات چھین کر اسے انبوہ کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس کی حقیقی آزادی چھین لی گئی وہ قوت ارادی اور قوت فیصلہ سے عاری ایک بے حیثیت فرد کے طور پر زندگی گزار رہا ہے اور اس احساس تک نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ افتخار بیگ ڈاکٹر، وجودیت اور اردو شعری طرز اظہار، پورپ اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۶، ص ۶۵

۲۔ سلطان علی شیدا، وجودیت پر ایک تنقید نظر، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۷۸، ص ۳۵

۳۔ سید ماجد شاہ، ر، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸

۴۔ سید ماجد شاہ، ق، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶، ص ۲۵

۵۔ افتخار بیگ، ڈاکٹر، وجودیت اور اردو شعری طرز اظہار، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶، ص ۲۵، ۲۶

۶۔ سید ماجد شاہ، ر، ص ۱۸

۷۔ جمیل احمد مجبی، ڈاکٹر فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۰۲، ص ۲۳

۸۔ سید ماجد شاہ، ر، ص ۱۸

۹۔ ایضاً، ص ۵۷

۱۰۔ حیات عامر حسینی، وجودیت، بتول پبلی کیشنز، سرینگر، ۱۹۹۱، ص ۳۷

۱۱۔ سید ماجد شاہ، ر، ص ۵۷

۱۲۔ سید ماجد شاہ، ق، ص ۳۳

۱۳۔ خالد محمود (مرتب)، سارتر ادب فلسفہ اور وجودیت نگارشات پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۵۹۶

۱۴۔ سید ماجد شاہ، ق، ص ۸۷

۱۵۔ افتخار بیگ، ڈاکٹر، وجودیت اور اردو شعری طرز اظہار، ص ۱۳۷

۱۶۔ سید ماجد شاہ، ق، ص ۶۰

۱۷۔ جمیل احمد مجبی، ڈاکٹر فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، دہلی، ۲۰۰۲، ص ۴۰

۱۸۔ سید ماجد شاہ، ق، ص ۶۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۴

۲۰۔ سید ماجد شاہ، ر، ص ۴۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۷

۲۲۔ خالد محمود (مرتب)، سارتر ادب فلسفہ اور وجودیت، ص ۱۰۹

۲۳۔ سید ماجد شاہ، ر، ص ۵۹

۲۴۔ خالد محمود (مرتب)، سارتر ادب فلسفہ اور وجودیت، ص

۲۵۔ سید ماجد شاہ، ق، ص ۱۳۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۲۷۔ قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۵، ص ۴۷

باب چہارم: سید ماجد شاہ کے افسانوں میں فرد کی انفرادیت

الف۔ فرد کی انفرادیت کا وجودی پس منظر

فرد کی انفرادیت سے مراد اس کی موضوعیت یعنی (Subjectivity Of Idividual) ہے۔ یہ فرد کی داخلی کیفیات ہیں انگریزی میں اس کے لئے Idividualism اور Individuality,Subjectivity جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ فرد کی انفرادیت سے مراد فرد واحد کا وجود، اس کے احساسات و جذبات، ذاتی رائے اور تجربات و مشاہدات ہیں۔ جس کے غلط، درست کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ وہ اپنے انتخاب میں آزاد ہے۔ کسی دوسرے کو اس کے داخلی معاملات میں دخل اندازی کی قطعا اجازت نہیں اور یہ کہ وہ اپنے داخلی اور موضوعی رویوں سے حاصل ہونے والے نتائج کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ موضوعیت کا متضاد لفظ معروضیت (Objectivity) ہے۔ یعنی خارجی کیفیات داخلی اور خارجی کیفیات دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ لہذا خارجی واقعات فرد کی داخلی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ انفرادیت کی تعریف جاننے سے قبل وجودیت کی تعریف لازم ہے تاکہ انفرادیت کا مفہوم اور اہمیت واضح ہو سکے۔ اس ضمن میں قاضی جاوید اپنی کتاب "وجودیت" میں لکھتے ہیں:

> "وجودیت فرد کی بے مثل انفرادیت پر اصرار کرتے ہوئے فطرت اور طبعی دنیا کی عمومی خصوصیات کے مقابلے میں انسانی وجود کو بنیادی حیثیت دیتی ہے"(۱)

یہ تعریف اس بات کو واضح کرتی ہے کہ وجودیت دراصل معروضی دنیا کی بجائے حقیقی تجربات، مشاہدات اور ذاتی علم و عمل کا نام ہے۔ یہ ایک طرز حیات ہے جو فرد کے شخصی مسائل اور اس کی داخلی زندگی پر اٹھنے والے سوالات پر بحث کرتی ہے۔ تمام وجودی مفکرین فرد کی بے مثل انفرادیت اور داخلیت پر اصرار کرتے ہیں ان کے ہاں روحانی وارداتیں موضوعی کیفیات ہیں۔ معتبر فرد ہمیشہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کی سعی کرتا ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یقینا غیر معتبر وجود کہلائے گا۔ وجود کی سچی داخلیت ہی اصل انفرادیت ہے۔ سیاسی، سماجی تہذیبی اور مذہبی تغیرات نے فرد کی موضوعی زندگی اور انفرادیت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ فرد کی انفرادیت کو خطرے میں ڈال کر اجتماعی مقاصد حاصل کیے گئے اور دقیانوسی نظاموں کو مسلط کیا گیا۔ ایسے میں اس کی ذات کا اثبات اور انفرادیت کا معیار بھی مجروح ہوتا رہا۔ انقلاب، جنگیں، مذہبی و اخلاقی

تغیرات سب فرد کی موضوعی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہے۔ سبھی وجودی مفکرین چاہے وہ الہیاتی ہیں یا الحادی ہیں فرد کی موضوعیت اور انفرادیت کے حوالے سے متفق ہیں۔ وہ فرد کو معروضی اور مادی دنیا کا جزو تصور کرنے سے انکاری ہیں۔ انسان کا اس دنیا میں موجود ہونا ہی اس کے منفرد ہونے کی دلیل ہے۔ اس کائنات میں اس کی شمولیت کی وجہ سے اس کا جسم ہے۔ یہی بات اسے اپنی انفرادیت کو کھوجنے پر مجبور کرتی ہے کہ اسے وسیع کائنات میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ اس کی زندگی اور پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب تجریدی عقلی یا سائنسی نہیں ہوسکتے فرد کا وجود ایک راز ہے جسے وہ بذات خود ہی آشکار کر سکتا ہے۔ کوئی دوسرا فرد بطور معروض اسے استعمال نہیں کر سکتا نہ ہی اس پر کسی نظام کو مسلط کر سکتا ہے۔ وجودی مفکر وجود کی انفرادیت کو لے کر اس قدر جذباتی ہیں کہ وہ معروضی اور مادی دنیا کی کسی شے کو وجود کا ہم پلہ تصور نہیں کرتے ان کے نزدیک فرد کا اپنا جوہر بھی اس کے وجود کے بعد آتا ہے وجود انسانی دنیا کی ہر شے پر مقدم ہے۔ یعنی بقول اقبال:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

فرد جب معروض سے اکتا جاتا ہے تو اسے چند سوال اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ میں کیا ہوں؟ میری حیثیت کیا ہے؟ کیا میں ایک معتبر فرد ہوں یا میری حیثیت محض ایک شے یا جانور (IT) کی سی ہے۔ ان سوالوں کے جواب اسے عقلی اور تجریدی فلسفوں سے میسر نہیں آتے تو وہ اپنی ذات پر یقین کرتا ہے۔ اپنی ہستی اور من میں پناہ تلاش کرتا ہے۔ جو موضوعی رویے اسے یقین، آگہی اور آزادی کی راہ دکھاتے ہیں۔ یوں وہ اپنی ذات کو انفرادی حیثیت سے معتبر کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اساسی و موضوعی کیفیات براہ راست فرد کے وجود سے متعلق ہیں۔ وجود کی یکجائی کا تصور اس کی موضوعیت سے جنم لیتا ہے۔ فلسفہ وجودیت کے مطابق فرد اس کائنات کا جزو نہیں بلکہ اس کے ساتھ منسلک ہے یہ تعلق بہت طاقتور ہے۔ انفرادیت کا عنصر ہمیں وجودیت کے دو موضوعات میں نمایاں نظر آتا ہے۔ جو کہ موضوعیت و صداقت اور امکان و انتخاب ہیں

موضوعیت ہیں اصل سچائی (صداقت) ہے۔ جس سے روشناس ہو کر فرد دنیا کا شعور حاصل کرتا ہے۔ دنیا سے تعلق بھی ضروری ہے مگر اپنے آپ کو دنیا سے ممیز کرنا بھی اہم ہے۔ تاکہ وہ "میں" (I) کی حیثیت سے جیئے نہ کہ "یہ" (IT) ہو کر بے وقعت شے ہو کر رہ جائے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر افتخار لکھتے ہیں:

"وجود کی دوسری بڑی خصوصیت پر دیا موجود کا یکتا / لاثانی اور منفرد ہونا ہے۔ اس کی انفرادیت اس کی "میں" میں پنہاں ہے۔ کیوں کہ فرد کی "میں" صرف اس فرد سے متعلق ہے اور وہ اپنے ہونے کے حوالے سے کسی بھی دوسرے سے مماثل نہیں۔ اس طرح وجود کسی بھی کل کا جزو نہیں سو وہ ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔"(۲)

اپنے آپ کو یکتا ماننا ہی اصل انفرادیت ہے۔ خود کو "میں" کے درجے تک لانا اور یہ جان لینا کے میری کسی سے کوئی مماثلت نہیں اور یہ کہ فرد ایک سماجی ہستی ہے۔ فطرت اور سماج میں سب سے معتبر وجود ہے نہ کہ اس کل کا جزو ہے۔ ہر شخص اپنے ایک معتبر وجود اور انفرادی تقدیر کے ساتھ دنیا میں آیا ہے اور وہ ایک کامل شخصیت کے ساتھ موجود ہے۔ وہ خود کو ایک وجود اور معتبر ماننا ہی اصل موضوعیت ہے اور یہی موضوعیت سچائی ہے۔ وجودی فلاسفر کرکیگارڈ سے لے کر ژاں پال سارتر تک سبھی وجودی مفکرین متفق نظر آتے ہیں بس فرق صرف اتنا ہے کہ الہیاتی وجودی مفکرین موضوعی صداقت کے لیے خدا سے رجوع کرتے ہیں جبکہ الحادی وجودی مفکرین صرف اپنے وجود پر ہی انحصار کرتے ہیں۔

فرد تاحیات معروضی دنیا کے امکانات سے نبرد آزمار ہتا ہے۔ اس صورت حال میں اسے بارہا کرب، اذیت اور تشویش کے مراحل سے گزرنا لازم ہے۔ وجودی مفکر کرکیگارڈ کے نزدیک جو شخص کرب میں تربیت پاتا ہے وہ زندگی کی لامحدودیت سے نبرد آزمار ہا۔ اور ایسا فرد سب سے معتبر اور بھاری ہے کیونکہ اس توسط وہ خود سے آشنا ہوتا ہے اور کوئی بھی امکان اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ وہ وجود کے انتخاب سے جڑ کر اچھائی یا برائی میں ڈھلتا ہے۔ امکان ایک ایسا امتحان ہے جو فرد کو معتبر یا نامعتبر بنانے میں مددگار ہوتے ہیں۔ یہ امکانات صورتحال سے جڑی داخلی کیفیات ہیں۔ اسی صورتحال میں فرد کو زمانیت اور محدودیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے امکان کی اچھائی اور برائی کا انتخاب اور پھر فیصلہ کرنا وہ بھی اپنی شخصی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے یہ ایک مشکل صورتحال ہے۔ انتخاب ہی وہ لمحہ ہے جو فرد کو اپنی موضوعیت پر یقین رکھنے اور کسی ماورائی طاقت (خدا) کے قریب کرتا ہے اور وہ اس سے روحانی طاقت لیتے ہوئے فیصلہ کرنے کی جرات کرتا ہے۔ یوں خود تفہیمی کا یہ سلسلہ ابدی استحکام کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ وجودیت کا اساسی نقطہ نظر ذات پر یقین اور آزادی ہے۔ جس کے چشمے موضوعیت سے پھوٹتے ہیں۔ ہمارے ہاں مشرقی وجودیت کے تناظرات پر اگر نظر دوڑائی جائے تو اقبال اور وجودیت میں جو موضوع مشترک ہے وہ بھی فرد کی انفرادیت (موضوعیت) ہے۔ خود

آگہی ، یکتائی ،اثبات ذات ، آزادی اور موضوعی سچائی ہی ایک فرد کے وجود کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ب۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں میں فرد کی انفرادیت

سید ماجد شاہ کے افسانے جدید دور میں پیدا ہونے والے وجودی مسائل کا عکس لیے ہوئے ہیں۔ان کے افسانے،ذاتی ، سماجی ، تہذیبی ،نفسیاتی دباؤ اور ماحولیاتی اضطراب کی پیداوار ہیں ۔ آپ کے افسانوں کے موضوعات عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ جو زندگی کی کڑواہٹ اور اس کی دلکشی سے بھرپور نظر آتے ہیں جو دوران مطالعہ قاری کی ذہنی فکر کو متحرک کر دیتے ہیں۔یوں ان کے کردار مضوعی پردوں سے نکل کر حقیقی زندگی میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ سید ماجد شاہ کے ہر افسانے کے کردار ایک دوسرے سے منفرد ہیں۔بقول سید ماجد شاہ انکے افسانوی کردار بالکل انسانوں کی طرح اپنی ذات و صفات اور کردار و سیرت کے حوالے سے مختلف ہوتے ہیں۔ جو کہ "کوک بھرا" کھلونا ہے۔ یہ سبھی کردار تقدیر کا جبر ،ماحول اور معاشرے کا جبر ، زمانے اور نفسیات کا جب سہتے ہیں۔ سبھی کردار اپنی انفرادیت اور داخلی آزادی کی جنگ لڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر کردار مکمل نظر آتا ہے۔ ہر کردار حسین ہے اور انفرادی طور پر اپنے وجود کی بقا اور اثبات کی جنگ لڑنے میں مصروف ہے۔ سید ماجد شاہ کے موضوعات، کہانیاں اور کردار اسی بنا پر انفرادی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ معاشرے کے وجودی پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور انفرادی طور پر زندگی کی نفسیات کی تہیں کھولتے نظر آتے ہیں۔ سید ماجد شاہ نے انہی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ جن پر ہمارے سماج میں بات کرنا جرم سمجھا جاتا ہے یہی جرات ان کے افسانوں کو انفرادی طرز کا حامل بناتی ہے۔اس باب میں ہم سید ماجد شاہ کے افسانوں میں فرد کی انفرادیت کا تجزیہ کریں گے۔

افسانہ "گھومنے رے سورج"

افسانہ "گھومنے رے سورج" سید ماجد شاہ کے افسانوی مجموعہ "ق" سے لیا گیا ہے۔ افسانے کی کہانی فرد کی انفرادی زندگی اور اس کی شخصی آزادی پر مبنی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک عورت (اریشں) ہے۔ جو زندگی کی محدودیت اور زمانیت سے اکتاہٹ کا شکار ہے۔ اسے اپنی زندگی دوسروں کی مرضی سے جینے اور اپنی عمر کے ضائع ہونے کا دکھ ہے اس نے اپنی عمر کے اکتیس سال ایک ایسے شخص کے نکاح میں گزار دیئے جسے وہ پسند نہیں کرتی تھی اور یہ سب اس نے اپنے والدین کی عزت کے لئے برداشت کیا۔ اس دوران اسے اپنی پہلی

محبت کو چھوڑنے کی اذیت سے بھی گزرنا پڑا وہ ناسٹیلجائی کیفیت سے گزرتی ہے۔ وہ ماضی کے حسین دنوں کو یاد کرتی ہے جب وہ بیس برس کی لڑکی تھی۔ ماضی حال، مستقبل سے بے نیاز خود میں محو زندگی سے بھرپور لڑکی۔ لیکن پھر ماضی کی ایک غلطی جس کی سزا اس نے اکتیس برس کاٹی۔ اپنے انتخاب کے لیے وہ ہمت نہ کر سکی باپ کی پگڑی، بھائیوں کی عزت اور ماں کی نصیحت پر اس نے اپنی تمام خوشیاں نچھاور کر دیں اور پھر سالوں ایک جلاد اور بد شکل شوہر کو برداشت کیا وہ تادیر ماضی کی حسین یادوں اور زندگی کی تلخیوں کو یاد کرتی رہتی ہے۔ اسی کیفیت میں وہ یہ سوچتی ہے کہ سورج الٹا گھومے وہ دیکھتی ہے کہ وقت کا پہیہ رک گیا وہ مسلسل دوہراتی ہے گھوم رے سورج۔۔۔ الٹا گھوم۔۔۔ سورج اریش کے اشارے پر گھومتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بیس سال کی لڑکی بن گئی۔۔۔ اب کے بعد کی زندگی وہ اپنی مرضی اور بہتر فیصلے کے ساتھ گزارنے کا سوچتی ہے ایسی پُر امید اور رجائی کیفیات لیے افسانہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے تمام افسانہ موضوعی کیفیات سے لبریز ہے۔ جس میں کردار اپنی داخلی طاقت کے تحت خارجی امکانات سے نبرد آزما ہونے کی کوشش میں ہے۔ سید ماجد شاہ نے فرد کی اس طرح بھی حالت کو کس طرح بیان کیا ملاحظہ ہو:

> "اریش ایک نقطے پر نظریں جمائے ریت پر بیٹھ گئی۔ بالآخر ایک مدت ہوئی ریاضت رنگ لائی سورج رنگ بدلنے لگا۔ کیا ہوا اور دھبہ بن کر غائب ہو گیا۔ اس نے جادوگر کا سکھایا منتر پڑھنا بند کر دیا اور حکم چلانے کے لیے تیار ہو گئی۔" میں اریش بنت سعادت عمر اکیاون سال جو پچھلے دس سال سے رحمت ولد کرامت کے نکاح میں ہوں۔۔۔ تجھے حکم دیتی ہوں کہ تو میرے اشارے پہ الٹا گھوم جا۔"(۳)

بظاہر تو یہ ایک خواب کی سی کیفیت ہے اور سوائے تخیل کے کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن افسانہ فرد کی پوری زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فرد کا یہ المیہ ہے کہ وہ زندگی سے وابستہ ہو جاتا ہے اور پھر یہ وابستگی اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ خارجی صورتحال اور داخلی اضطراب سے فرد کی ذات میں ایک خانہ جنگی کی کیفیت رہتی ہے۔ کبھی امکانات کی جیت ہوتی ہے اور کبھی فرد حالات پر قابو پالیتا ہے۔ زندگی کی محدودیت اور زمانیت کا المیہ فرد کو ہمیشہ مشکلات کا شکار رکھتا ہے۔ لیکن وہ اپنی انفرادی صلاحیتوں اور اعتماد سے امکانات سے لڑنے کی سعی کرتا ہے۔ کبھی موجودہ امکانات سے تنگ آکر اپنی موضوعی و داخلی کیفیات سے طاقت لیتی۔

وہ اپنی گزری ہوئی بے مقصد زندگی کا ازالہ چاہتی ہے کیونکہ موجود فرد کو اتنی آگہی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اس دنیا میں انفرادیت اور معتبری کے ساتھ رہے۔ یعنی منفرد ہونا اس کی مجبوری ہے یہ اثبات ذات کا ہی نتیجہ ہے جس نے فرد کو کرب و اضطراب کی بھٹی میں جھونک دکھا ہے۔ جس میں تپ کر وہ خالص اور کندن ہوتا ہے۔ افسانوی کردار بھی اپنی ذات سے علیحدگی اور خارجی معاملات کی مداخلت کا شکار ہے۔ اس تصادم و تضاد کی فضا نے ایک اضطراب اور تشویش کو جنم دیا ہے۔ اس سے قبل یہ ایسی کیفیت ناامیدی یا قنوطیت کی طرف رخ کر لیتی۔ مصنف نے اسے مقصدیت اور انفرادیت سے سرشار کر کے ایک روحانی اور داخلی تعلق سے ہمکنار کر دیا۔ اس طرح وہ دوبارہ سے اثبات ذات کی طرف متوجہ ہو کر اپنی ذات کی دوبارہ بازیافت کا ارادہ کرتا ہے۔ اختتامی پیراگراف میں سید ماجد شاہ نے کس طرح جائے احتیاط کا سہارا لیتے ہوئے اریش کی موضوعی کیفیت کو بیان کیا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ہوا تیز چل رہی تھی چراغ جل رہا تھا چراغوں کی کرنوں پر آج تیرگی کے ناگ کمرے میں داخل ہوتے رہے۔۔۔ پر اس کا عزم آہنی تھا۔ اکتیس سال کے عذاب جتنا بوجھ اٹھائے رات گزر گئی۔ جب صبح اسے اس وقت بدصورت کی ڈولی میں بٹھایا جا رہا تھا تو اس نے سورج کو حقارت سے دیکھا جیسے وہ ایک بار پھر اسے گھمانے کی جرات رکھتی ہو۔"(۴)

زندگی اسی عزم و حوصلے سے عبارت ہے جب معروضیت اور مادیت کے ہجوم سے لایعنی کیفیات سے نکلنے کی سعی کرتا ہے۔ یوں موضوع سچائی اور خارجی حالات میں توازن پیدا کرنے کی ہمت کرتا ہے۔ چاہے وہ عمر کے جس حصے میں ہوں اپنے وجود کے اثبات اور انفرادیت کی جنگ لڑ سکتا ہے۔

افسانہ "کیچڑ"

افسانہ "کیچڑ" سید ماجد شاہ کی کتاب "ق" سے لیا گیا ہے۔ افسانہ نیم علامتی انداز لیے ہوئے ہے۔ افسانے کی کہانی ایک ایسے فرد کے گرد گھومتی ہے جو ایک عمر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن سماجی جبر اسے اجتماعی ماحول اور روایات کا حصہ بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کا باغیانہ رویہ اور مزاحمتی انداز معاشرے کے جبر کے سامنے آہنی دیوار کی مانند کھڑا رہتا ہے۔ مگر معاشرتی روایات دقیانوسی نظام اور مذہبی و اخلاقی اقتدار رفتہ رفتہ دیمک کی طرح اس کی طاقت کو چاٹ جاتی ہیں۔ ضغیم جو کہ ایک سفید پوش نوجوان تھا۔ اسے اپنی سفید پوشی اور انفرادیت پر ناز تھا۔ وہ بہت محتاط تھا کہ روایتی نظام کا حصہ نہ بنے۔

مگر سماجی شکست وریخت کی شروعات سے ہی اس کا یہ بھرم بھی ٹوٹنے لگا۔ ضغیم کل تک جو بزرگوں کی آنکھ کا تارا اور قبیلے کا فخر تھا رفتہ رفتہ اپنی باغیانہ روش کی بنا پر سب کی نظروں سے اتر گیا۔ وہ حیران سوچتا کہ کل جن باتوں پر لوگ فخر محسوس کیا کرتے تھے وہ آجکل باعث شرمندگی سمجھے جاتے ہیں اور اب صرف مذہب اور ادب کا حصہ یا قصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ فرد کی موضوع زندگی میں بے جا مداخلت اور اجتماعی خارجی رویوں کی مذمت کرتے ہوئے سید ماجد شاہ لکھتے ہیں:

> "ہمارے محققین جو بال کی کھال اتارنے میں ماہر ہیں انہیں تو موقع ملنے کی دیر تھی۔ پھر کیا تھا کس نے یونانیوں اور مصریوں اور سومیریوں کی معاشرت سے مثالیں کشید کیں۔ بعض صاحبان علم نینڈر تھل کے خون کے تجزیہ اٹھالائے بندروں کی مہین سوں سے ہوتے ہوئے کائی تک کو جانچ آئے۔ ہمارے کچھ مشرق پرست دوست موہنجو داڑو اور کوٹ ڈی جی سے جنگی اوزار اٹھائے رزم گاہ میں داخل ہوئے مذہبی مہربانوں نے قدیم صحیفوں کی چھان بین کی تو مٹیالے نور سے دنیا جگ مگ کرنے لگی اور رواج کے پیکر نے روایات کا چولا پہن لیا۔"(۵)

اقتباس میں پوری انسانی تاریخ کا نچوڑ ملتا ہے کہ کس طرح انسانی جنگل نے نظاموں اور روایات کے چنگل میں جکڑ کر فرد کی انفرادی زندگی کو داؤ پر لگایا۔ وجودیت تو ہر اس نظام کی نفی کرتی ہے جو فرد کی ذات اور وجود کے اثبات کے خلاف ہو۔ چاہے وہ سیاسی، سماجی، تہذیبی یا مذہبی اقدار ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ ہمیشہ اجتماعی مقاصد اور نظاموں کی اشاعت وترویج کے لیے فرد کو نشانہ بنایا گیا۔ افسانے کا مرکزی کردار ضغیم بھی خود مرکزیت کی کیفیت میں رہنا چاہتا ہے جو اسے آزادی کا احساس دلاتا ہے۔ یہی آزادی اسے زندگی سے لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ لیکن آزادی کی سزا ملتی ہے۔ اس سزا کو کاٹنے کے لئے فرد خالص موضوع جذبوں کو بروئے کار لاتا ہے اور زندگی کی محدودیت اور روایات کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ضغیم کا اجلا پن اس کا جرم بن چکا تھا وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر تنہائی اور لایعنیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالآخر وہ ہار مان لیتا ہے نیا فیصلہ لینے کے لئے اسے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ اس نے سوچ لیا کہ اس دنیا میں رہنے کے لیے اسے اس کا حصہ بننا ہوگا۔ اجلے پن کی اہمیت نہیں رہی اسے بھی کیچڑ میں لت پت ہونا پڑے گا۔ بیچ بازار میں گر کر خود کو اجتماعی کیچڑ میں میلا کر لیتا ہے۔ سبھی اپنے بدبودار میلے لباس لے کر اس کے فعل پر خوش تھے کہ رواج بدل

گیا۔ لیکن یہ فرد کی ایک عارضی ہار ہے۔ وہ خود کو دوبارہ اس منفیت سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود انحصاری اور خود مرکزیت کا احساس دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ فرد کو دنیا میں رہنے اور دوسرے لوگوں سے وابستگی قائم رکھنے کے لئے کبھی کبھار جھکنا پڑتا ہے۔ اسی لمحے اس کی انفرادیت خطرے میں ہوتی ہے۔ کیوں کہ ایک طرف وہ روایتی نظام کا حصہ بن جاتا ہے تو دوسری طرف زندگی کی محدودیت اس کا منہ چڑا رہی ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے دنیاوی وابستگیاں مہنگی پڑتی ہیں۔ منیر نیازی نے ایسی ہی کیفیت کے بارے میں کہا ہے:

منزلیں آسان بہت تنہا سفر کرنے میں ہیں
رنج ہیں جتنے سفر میں ہم دونوں کے دم سے ہیں

افسانہ "جلا کر راکھ کر دینے والی ٹھنڈک"

افسانہ "جلا کر راکھ کر دینے والی ٹھنڈک" سید ماجد شاہ کے افسانوی مجموعے "ق" انتخاب کیا گیا ہے۔ کہانی ایک بوڑھے فنکار (ادیب) کے گرد گھومتی ہے جو اپنی کہانی کا مواد اکٹھا کرنے اور اسے انفرادیت بخشنے کے لیے ایک حقیقی تجربے سے گزرتا ہے۔ وہ محض مشاہدے کی کیفیت پہ اکتفا نہیں کرتا بلکہ تجربات کی روشنی میں اپنی کہانی کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ ایک کم عمر لڑکی سے عشق رچاتا ہے۔ جو کہ راز نہیں رہتا۔ اس فنکار کے جوان بیٹوں اور لڑکی کی والدہ کے سامنے آشکار ہو جاتا ہے۔ لڑکی کی ماں فنکار کو واہیات گالیوں سے نوازتی ہے اور اسے کم عمر لڑکی کی زندگی برباد کرنے پر لعن طعن کرتی ہے۔ فنکار کے بیٹے بھی شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے چھوڑ جانے کا تہیہ کر لیتے ہیں۔ لڑکی بضد ہے کہ اسے فنکار سے محبت ہے اور وہ اس سے شادی کرے گی۔ مگر فنکار یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ مجھے تو بس ایک کہانی لکھنی تھی اور میں اس تجربے سے گزرا لڑکی کے لفظ گم ہو جاتے ہیں جبکہ فنکار کا فن اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار کس طرح اپنے فن کو جلا اور انفرادیت بخشنے کے لیے تجربے سے گزرتا ہے۔ جس میں اسے ذاتی توہین اور بے عزتی کی سے گزرنا پڑا۔ اسی مشقت اور کشمکش کا اظہار کس طرح لکھاری نے افسانے میں کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"تو میں یہ بتا رہا تھا کہ فنکار کو مواد اکٹھا کرنے کے لئے کن کٹھن مراحل
سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی ہلاک کر دینے والی بلند چوٹیوں تک پہنچتا ہے
جہاں آکسیجن کی کمی پھیپھڑوں کو پتھر بنا دیتی ہے۔ گلیشیئر کی ٹھنڈک
میں نظریں تک جم جاتی ہیں۔ کبھی خار دار جھاڑیوں سے پوچھ تار تار ہو

جاتی ہے۔ بدن کا ستر آشکار ہو جاتا ہے۔ عموماً بیچ کی راہ فریب کی وادی
سے ہو کر گزرتی ہے۔ اب اسے ہر جائی کہوں یا دغاباز پر حقیقت میں یہی
وہ فن کار ہے جس کے فن سے ہڈیوں کے گودے کی مہک آتی ہے "(۶)

فرد کی زندگی حرارت، لگن اور تڑپ سے عبارت ہے۔ کیونکہ یہی احساس زندگی سے وابستگی کا احساس دلاتے ہیں لیکن ان سب وابستگیوں کے ساتھ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا ایک مشکل اور کٹھن راستہ ہے۔ محدود ہمت، حدود امکانات، سماجی و اخلاقی اقدار کے پھندے ملکر فرد کو اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ذات کا یقین اور داخلی وارداتوں کی عطا کی ہوئی موضوعی طاقت اسے جہد مسلسل پر اکساتی ہے اور وہ شکست قبول نہیں کرتا کیونکہ شکست تسلیم کرنے میں اس کے وجود کی نفی ہے افسانے کا مرکزی کردار بوڑھا فنکار بھی اپنی ذات کی توہین برداشت کر لیتا ہے مگر کسی صورت حال ماننے سے انکاری ہے کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اپنے موضوعی تجربے کی نفی کرتا ہے اس لیے وقتی آلام کو برداشت کرتا ہے اور فن اور تجربے کو دوام بخشتا ہے۔ یہی اس کے اساسی رویے کی انفرادیت ہے جو اس کے بعد بھی قائم رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وجودی مفکرین موضوعیت کو سچائی قرار دیتے ہیں۔ فلسفہ وجودیت میں انسانی اعمال و تجربات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سخت مشکل حالات اور صورتحال میں اپنے وجود کی دریافت کرنا ہی موضوع سچائی ہے ڈاکٹر حیات عامر حسینی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

" وجودی فلاسفر ذات کی بجائے ہونے(Becoming) اور
کلی(Universal) کے بجائے انفرادی(Particular) اور
ماہیت(Essence) کے بجائے وجود(Existence) میں دلچسپی لیتے
ہیں۔"(۷)

یعنی فلسفہ وجودیت ہر دور میں فرد کی انفرادیت کی آواز رہی۔ وہ فرد کی یکتائی اور اثبات پر اٹھنے والے سے بھی سوالات کا جواب ہے۔ فن و ادب میں موضوع احساسات کی کمی، اخلاقی و جمالیاتی اقتدار کی کمی ہی وجودی فلسفہ کا خام مواد ہے۔ اسی سے نئی تاویلیں اور تنقید جنم لیتی ہے۔ اگر افسانہ "جلا کر راکھ کر دینے والی ٹھنڈک کو" نطشے اور ژاں پال سارتر کی زندگیوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو دونوں فلسفیوں نے اپنے وجود کے اثبات اور انفرادیت کی تلاش میں خدا کے وجود سے بھی انکار کر دیا۔ ممکن ہے کہ یہ انکار کا تعین نہ ہو ان کے ذہن و دل کے کسی گوشے میں کوئی عقیدہ ضرور موجود ہو مگر اس انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہے انسان تمام اقدار کا

خود خالق ہے اور اپنے تمام اعمال کا ذمہ دار بھی خود ہے وہ اپنی زندگی کی ترتیب ، تہذیب، تحریک حتی کہ تخریب کا بھی ذمہ دار خود ہے۔ یہاں بوڑھا فنکار بھی اپنے فن کو انفرادیت بخشنے کے لئے اپنے تلخ تجربے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ وقتی توہین کا احساس دل گرفتہ ضرور ہے مگر اپنی کہانی کی تکمیل اور فن کو یکتائی کا کمال دینے کے لئے یہ قربانی کچھ زیادہ بڑی نہ تھی۔ اس کی کہانی فن کے آسمان پر روشن ستارے کے مانند چمکتی رہے گی۔ چاہے اس کا ظاہری وجود رہے نہ رہے۔ نہ ہو کے بھی وجود ہونے کا ہنر صرف قلم کار کے پاس ہے وہ اپنے موضوعی احساسات کے ساتھ کسی بھی کردار میں موجود رہتا ہے اور امر ہو جاتا ہے۔

افسانہ "کم حسن / زیادہ حسن"

افسانہ "کم حسن / زیادہ حسن" سید ماجد شاہ کے مختصر افسانوں کے مجموعے "ر" سے انتخاب کیا گیا ہے۔ افسانہ علامتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ جہاں زندگی کو ایک ڈرامے اور دنیا کو سٹیج سے تعبیر کیا گیا ہے۔ افسانے کی کہانی ہیروئن کے حسن کے گرد گھومتی ہے۔ یعنی یہ دنیا چڑھتے سورج کے پجاری ہے۔ جو سامنے ہے وہی معتبر ہے۔ زندگی فرد کے لئے اہم ہے لیکن وہ لمحہ بہ لمحہ فرد سے گریزاں بھی ہے۔ جس طرح ریت مٹھی میں بند نہیں ہو سکتی اسی طرح زندگی کو ٹھہرایا نہیں جا سکتا۔ وہ ہر لمحہ پر کے ہاتھوں سے سرکتی جاتی ہے۔ افسانہ ہمیں زندگی کی محدودیت، محدود رستے اور عارضی پن کے ورق سے آشنا کراتا ہے۔ جہاں موضوعی اور انفرادیت کی اہمیت صرف ظاہری حسن و خدوخال کو سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف موضوعیت فرد کو وقت اور حالات کی نزاکتوں سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ وہ ماحول اور اس کی دلکشی کو زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس لمحے اس مادی دنیا کی ترجیحات بدل جاتی ہیں یوں تنہائی کرب اور لایعنیت فرد کو جکڑ لیتی ہے۔ لیکن ایک معتبر فرد کسی صورت اپنی انفرادیت کو کھونا نہیں چاہتا نہ ہی اس سے دستبردار ہوتا ہے۔ اس صورتحال میں پیدا ہونے والا کہرام اور ذات کی تکلیف سے روشنی پھوٹتی ہے۔ اگر فرد اس سے استفادہ کرے تو وہ اپنی عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے۔ مادی دنیا کی بے ثباتی اور وجود کی کم مائیگی کو سید ماجد شاہ نے افسانے میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

> " یہاں صرف حسن والا معاملہ ہوتا تو شاید برداشت کر لیا جاتا۔۔۔
> دوسری ہیروئن ایسی جاندار انٹری دی کہ پہلی بدصورت ہو کر رہ گئی۔ نئی
> ہیروئن کا میانہ قد جھلمل جھلمل کرنے لگا۔ پہلی کا لمبا قد لمڈھینگ ہو کر
> رہ گیا۔ بڑے کشادہ ہاتھ ،بھاری بھر کم گھٹنے، پاؤں نسوانی کی بجائے

پہلوانی لگنے لگے۔ اس کی وہ آواز جو کانوں میں رس گھولتی تھی ترش اور بد
ذائقہ ہو کر رہ گئی۔ ہزار میں قسط تک پہنچتے پہنچتے حسن اور کم حسن والا
معاملہ بنا ہی نہیں۔ اور مسلسل بد صورتی میں بدلتا جا رہا ہے۔۔۔"(۸)

زندگی اسی اتار چڑھاؤ کا نام ہے۔ فرد بہتر سے بہترین کی تلاش میں سر گرداں رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو حیات جمود کا شکار ہو جائے۔ فرد کا یہ المیہ ہے کہ وہ کسی جمود کو بھی قبول نہیں کرتا۔ ایسے میں وہ اپنی انفرادیت کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ محدودیت ہر جگہ اس کا راستہ روکتی ہے۔ مگر وہ اپنی جوش و عمل اور جدوجہد سے زندگی کی لاشیت سے رجائی پہلو نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی لایعنیت اور بیگانگی فرد کو منفرد اور یکتا ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ بالکل افسانے کی ہیروئن کی مانند جب کوئی دوسرا وجود اس پر مسلط کیا جائے یا اس کے مقابلے میں آن کھڑا ہو تو ایسے میں کم حیثیت وجود اپنے جذبے سے طاقت لیتے ہوئے دوبارہ اپنی ذات کو درست اور معتبر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نطشے کے ہاں بھی یہی سوچ ملتی ہے کہ فرد اپنے برے وقت میں اپنی مشکلات اور مسائل سے فرار نہیں حاصل کرتا بلکہ وہ ان مشکلات کو کھوجتا اور جھیلتا ہے اور ان سے زندگی کشید کرتے ہوئے دوبارہ معتبری کی جستجو کرتا ہے۔ افسانہ کم حسن / زیادہ حسن بھی اسی موضوعی کیفیات کا عکس لئے ہوئے ہے کہ اس دور حیات میں یکسانیت اور جمود کا علم نہ ہو تو کس طرح دنیا کی ترجیحات بدلتی جاتی ہیں کس طرح زندگی کی محدودیت کو درپیش مسائل میں مبتلا کرتی ہے اور وہ کس طرح ان مسائل سے نمٹنے کے لئے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ ہر کوئی اپنا کردار ادا کرتا ہے اور پھر اسٹیج سے اتر جاتا ہے۔ اس کی جگہ کوئی نیا کردار لے لیتا ہے۔ جو اس سے زیادہ جاندار ہوتا ہے جو زندگی کا تسلسل چلتا رہتا ہے۔ یوں حیات جمود کا شکار نہیں ہوتی اور انفرادیت برقرار رکھنے کا عمل بھی جاری و ساری رہتا ہے۔

افسانہ "تھکا دینے والی صبح"

افسانہ "تھکا دینے والی صبح" سید ماجد شاہ کی کتاب "ر" سے لیا گیا ہے۔ افسانے کی کہانی ایک ایسے فرد کے گرد گھومتی ہے جس کے پاس پہلے وقت کی دولت موجود تھی۔ اس کے پاس فرصت تھی تاکہ وہ جی بھر کے جی سکے۔ اپنی من مرضی کے کِھل سکے۔ زندگی کے رنگوں کو دیکھ سکے اور فطرت کے رومان سے لطف اٹھا سکے لیکن پھر وقت گزر گیا۔ امتدادِ زمانہ اس کی جیب میں وہ سکے آ گئے۔ جو اس قدر بھاری تھے کہ وہ چھن چھن نہ کر سکے نہ ہی ان سے کوئی دھن ابھری۔ وہ سکے تھے ذمہ داریوں اور اس مشینی زندگی کے انبوہ کہ جن سے خرید و فروخت ممکن تھی۔ فرد اپنی موضوعیت اور انفرادیت کی خواہش لیے جہدِ مسلسل میں مبتلا ہے۔ وقت

کے وہ دلکش سکے جن سے اس کی داخلی اور اساسی تسکین جڑی تھی۔ وہ انہیں کھوٹا سمجھ کر دور پھینک آیا تھا لیکن اب انھیں کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ موجودہ ریز گاری کی بڑی اہمیت ہے کہ سورج اس کے در کا غلام ہے۔ وہ اپنی من مرضی سے ہر شے خرید سکتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے وہ روز اپنے خوابوں کا سودا کرتا ہے اور انہیں بازار میں پھینک آتا ہے۔ وجودی فکر میں ہمیں داخلی وارداتوں اور موضوعی جذبوں کی اہمیت جابجا ملتی ہے۔ انہی احساسات سے فرد کے من کو تسلی ملتی ہے۔ اور یہی داخلی رجحانات اسے بھرپور جینے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ فرد فطرت سلیم پر پیدا ہوا ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی سے لے کر جوانی تک تو داخلی اور موضوعی کیفیات کو زیادہ اہمیت دیتا ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس سائنسی اور مشینی زندگی کا حصہ بنتا جاتا ہے۔ سید ماجد شاہ نے اسی کیفیت کو اپنے افسانے میں خوبصورتی سے قلمبند کیا ہے:

> " کبھی میرے پاس کتنا وقت ہوتا تھا کہ لمحوں کی ریز گاری میری جیب بھری رہتی تھیں۔ میں جان بوجھ کر دوستوں کے سامنے اچھل کر چلتا تھا تاکہ جیب چھنکیں۔ میرے اچھلنے کے اندر میری ریز گاری کی دھنیں بنتی تھی۔۔۔ایک دن اچانک میری جیب میں وہ سکے آگئے جو بھاری بھر کم تھے جن سے میں خریدنے کی صفت سے آگاہ ہوا اور وقت کے سکے کے کھوٹے سمجھ کر میں نے کہیں دور پھینک دیے "(۹)

اقتباس ہمیں وجود کی اہمیت اور اس کے موضوعی رجحانات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس کی انفرادی حیثیت اور ان سے جڑے اساسی خوابوں کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ یہ شعوری اور اجتماعی کیفیات ہیں جن کا شکار اس اضطرابی دنیا کا کوئی بھی فرد ہو سکتا ہے۔ جو کہ خارجی دنیا کے فریب میں آکر اپنی انفرادیت اور اثبات ذات کو کھو دیتا ہے۔ اور انسانی جنگل میں اپنی شناخت گم کر لیتا ہے جب وہ نئے امکانات سے نبرد آزما ہوتا ہے اور اسے اپنے وجود کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ واپس اپنی تلاش میں نکلتا ہے۔ بہتر انتخاب کی کوشش کرتا ہے دوبارہ اپنی موضوع کی کیفیت کا سہارا لیتا ہے اور تسکین پاتا ہے۔ سید ماجد شاہ کا افسانہ "تھکا دینے والی صبح" میں بھی فرد کی انفرادی اور موضوعی کیفیات سے دوری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیگانگی، تنہائی اور لایعنیت کے شکار فرد کو کہانی کا مرکز بنایا گیا ہے۔ جو اپنی غلطی کا ازالہ چاہتا ہے اور پھر وہی خوشگوار اور حقیقی مسرت پانا چاہتا ہے جو اسے کبھی میسر تھی۔

افسانہ "سیکنڈ ہینڈ"

افسانہ "سیکنڈ ہینڈ" سید ماجد شاہ کی کتاب "ر" سے منتخب کیا گیا ہے افسانے کی کہانی اس کے عنوان ہی سے واضح ہو جاتی ہے موضوع گو کہ نیا نہیں مگر مصنف نے اسے نئے زاویے سے پیش کیا۔ جو کہ ہماری انفرادی نفسیات کی ترجمانی ہے اور اجتماعی سماجی زندگی کا بڑا المیہ افسانے کی کہانی میں ایسے دو افراد کی کہانی سنائی جارہی ہے جو مثالی اور روایتی عشق میں مبتلا تھے۔ مگر اپنے فن میں یکتا۔ شدید عشق کے ہوتے ہوئے بھی ان میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ زمانہ اس فیصلے پر حیران ہے سب اتنی محبت کرنے والے جوڑے کی علیحدگی پر پشیمان ہیں اور وہ بجا جاننا چاہتے ہیں۔ خاص کر وہ لڑکیاں جو اس مرد سے محبت میں مبتلا تھی۔ وہ جواب پانے کو بے تاب تھیں اور دوبارہ اپنے بارے میں غور و فکر کرنے میں مگن تھیں۔ آخر سب چھوڑ چھاڑ اس بات پر اتفاق کر لیتی ہیں کہ مرد کبھی سیکنڈ نہیں ہوتا۔ افسانہ اپنے اختتام پہ تشنگی کے ساتھ ساتھ کئی وجودی سوالات چھوڑ گیا۔ دو بھرپور افراد جو اپنے اپنے فن میں طاق تھے باوجود محبت کے ساتھ کیوں نہ رہ سکے؟ اور وجودی تعلق کے لئے سب سے اہم کیا ہے؟ اور مرد سیکنڈ نہیں ہوتے تو کیا زندگی کو ماپنے کے سبھی پیمانے عورت کے لئے ہیں؟ ان سبھی سوالوں کے موضوعی جواب کسی بھی تجریدی رویے یا رجحان سے ہی ملتے ہیں۔ دو ایک سے افراد میں سے ایک بھی اپنے آپ کو کم حیثیت ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ یوں لفظوں اور رنگوں کے الجھاؤ سے خلش پیدا ہوتی ہے کیوں کہ فن کار شخص میں یہ احساس بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے کہ اس کی ایک انفرادی حیثیت برقرار رہے۔ وہ اپنے موضوعی جذبوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور کسی دوسرے شخص کو خود پہ حاوی نہیں ہونے دیتا۔ نتیجتاً ایسے تعلق دیرپا نہیں ہوتے۔ وجودی فلاسفروں کے نزدیک وجودی تعلقات کی بنیاد صرف اس بات پر ہوتی ہے کہ دونوں میں سے ہر فرد دوسرے فرد کو اسی صورت قبول کرتا ہے کہ وہ یا تو اپنی داخلیت مٹا دے یا دوسرے کو بطور معروض استعمال کرے۔ اگر فرد دوسرے کو اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہے تو یہ قبضہ کوئی بھی باشعور موجود شخص کبھی نہیں تسلیم نہیں کرتا۔ کیوں کہ یہ اس کی انفرادیت اور موضوعیت کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔ یہ کے وجود سب کا اہم ہے۔ چاہے وہ مرد ہے یا عورت خواہشات کی تسکین سب کا حق ہے دونوں اپنے اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں کسی ایک فریق کو سیاست کی آزادی دے کر دوسرے کے لئے سبھی راہیں مسدود کر دینا وجودی نقطہ نظر سے گناہ ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"رضا دنیا کو لفظوں میں دیکھتا تھا جبکہ عنبرین رنگوں میں آخر میں دونوں کے رنگ اور لفظ الجھ گئے تو وہ الگ ہو گئے اب ان دونوں کے درمیان بہت بڑی دراڑ پڑ گئی ہے اتنی بڑی جتنی براعظموں کے بیچ ہوتی ہے۔ رضا بہت اکیلا ہو گیا ہے۔ بلکل تمہاری طرح اگر تم چاہو تو۔۔۔ سنا ہے کہ وہ کبھی سیکنڈ نہیں ہوتا"(۱۰)

اگر ہم اس افسانے کو وجودیت کو تحلیل نفسی کے تناظر میں دیکھیں تو سگمنڈ فرائڈ اور ژاں پال سارتر نے افسانے سے پیدا ہونے والے سبھی موضوعی سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ گو کہ وہ مکمل یا حتمی نہیں ہو سکتے مگر تسلی بخش ضرور ہیں۔ کوئی فرد کسی دوسرے کی انفرادیت پر حاوی ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ وجودی تعلق میں اپنے انفرادیت اوپر لگانا پڑی ہے یا دوسرے کو بطور معرض استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں فرد کی داخلی زندگی اور انفرادیت خطرے میں ہے۔ اور جب فرد اپنی انفرادیت بر قرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اذیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ تشکیک اسے اثبات ذات کے لئے قائل کرتی ہے۔

افسانہ "خواہشوں کے قطبیں"

افسانہ "خواہشوں کے قطبیں" سید ماجد شاہ کے مختصر افسانوی مجموعے "ر" سے لیا گیا ہے۔ افسانہ نیم علامتی انداز بیان لیے ہوئے ہے۔ جو ایک خود کلامی کی کیفیت ہے۔ افسانہ کا کردار ایسا فرد جو کہ اپنی داخلی کیفیات کے زیر اثر جینے کی کوشش میں ہے۔ جس کے لئے یہ کائنات یہ دنیا اس لئے پر کشش ہے کہ وہ اسے اپنے جذب دروں کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ وہ زمین و آسمان کی پیدائش پر غور و فکر کرتا ہے پھر وہاں اپنے وجود پر نظر آتا ہے اپنی اہمیت اور مقام جاننے کی کوشش کرتا ہے عرفان ذات اور صفات ذات کی سعی کرتا ہے۔ زندگی کی چمک تیرا ہی اسے دعوت پرواز دینے لگتی ہیں وہ اپنے تشکیک کے لمحوں سے حوصلہ لیتا ہے اور پرواز کے لیے پر کھول دیتا ہے۔ یہ پرواز در اصل نئے امکانات ہیں جن سے فرد کو بار بار نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ یہ تب ممکن ہے جب مرد عرفان ذات کے مناظر سے ہوتا ہوا اپنے جذبے دروں سے طاقت لیتا ہے اور اپنی زندگی کو خوبصورت بناتا ہے یہی وہ موضوعی سچائی ہے جو فرد کی انفرادیت اور یکتائی کو پرکھنے کی دعوت دیتی ہے۔ افسانہ خوبصورت رجاعی کیفیات کا عکس لئے ہوئے ہے رواں دل کش جملوں میں کس طرح موضوع کی کیفیت کو خارجی (معروضی) اس سے جوڑا گیا اقتباس ملاحظہ ہو:

"وہ چمکتی راہ مجھے دعوت پرواز دینے لگی۔۔۔ میں ہاتھ ملا کر آسمان کے قریب ہونے لگا۔۔۔ میں اڑنے لگا زمین ابھی اوزاون کی اوٹ میں نہیں آئی تھی کہ رات کی رانی کے ٹھنڈے جھونکوں پر ہولے ہولے رقص کرنے لگی۔۔۔ خوشبو کسی ایک گیت کی طرح مچل مچل کر تھرکنے لگی۔۔۔ تھرکتے تھرکتے اسرا کے خدوخال میں ڈھل گئی۔۔۔"(۱۱)

افسانہ "خواہشوں کی قطبیں" نیو وجودیت کی رجاعی کیفیات سے لبریز خوبصورت اور جاندار تحریر ہے۔ وجود اپنے انفرادی یقین کی بدولت اپنے انتخاب سے جڑا ہے یہی انتخاب بتاتا ہے کہ کسی فرد کی موضوعی حیثیت کیا ہے وجود پر یقین اپنی ذات کے سچائی کی جانکاری کے ذریعے اپنے ماحول میں خود کو میں کی حیثیت سے متعارف کرانا ہی انسانی پر انفرادیت ہے۔ افسانہ نگار نے بھی اپنے افسانے میں اس انفرادیت کا علامتی اظہار کیا ہے لیکن اختتام پھر بھی ایک اضطرابی کیفیت کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ فرد جذب دروں کے خوبصورت احساسات سے متصل ہو کر انتخاب کے درجے تک پہنچتا ہے تو امکانات اس کی راہ میں مخل ہو جاتے ہیں۔ قومی نقطہ نظر اور لگی بندھی روایات اس کے رستے میں ان کھڑی ہوتی ہیں۔ اور وہ پھر سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے بالکل کسی ستارے کی مانند جو کھلی فضا میں معلق ہو کر رہ جائے۔

افسانہ "سایہ پدری"

افسانہ "سایہ پدری" بھی افسانوی مجموعے "ر" سے منتخب کیا گیا ہے۔ مختصر بیانیے پر مشتمل یہ افسانچہ شخصی آزادی اور انفرادی کمال پانے کی خواہش پر مبنی ہے۔ جہاں ایک شخص لایعنی ہو کر لغویت کا شکار ہے۔ کیونکہ اسے جس انفرادی زندگی کی طلب تھی وہاں سے حاصل نہ کر سکا اس کے نزدیک ہر وہ شخص جس کا باپ جوان عمری میں مر جاتا ہے وہ بڑا آدمی بن جاتا ہے۔ اس کا غم منا رہا ہے کہ اس کا باپ ایک تناور درخت ہے جس کے سائے میں اس کی شخصیت پھول پھل نہ سکی اور بونا ہی رہ گیا۔ اسے اپنے حقیقی رشتوں (ماں، باپ) سے ایسا کچھ خاص عشق نہ تھا۔ لیکن وہ عظیم لوگوں کی داستان سن کر حیران تھا کہ سب کے سب یتیم تھے۔ یہاں تک کہ اس کا باپ بھی ایک عظیم آدمی تھا اور اس کے دادا جوان عمری میں ہی عاقبت سنوار گئے تھے۔ گو کہ یہ ایک بڑی ہی معیوب اور مضحکہ خیز صورت حال ہے۔ مگر فرد انفرادی سطح پر خود سے ایسے ہزاروں سوال کرتا ہے کیونکہ جب اس کی ذات اور ہستی اس سطح پر نہیں پہنچ سکتی جس کی وہ طلب کرتا ہے۔ مصنف نے اس نفسیاتی کیفیت کو کس طرح بیان کیا ملاحظہ ہو:

"باپ کا سایہ اسے زہر تو نہیں لگتا تھا اور نہ اسے ماں سے کوئی ایسا عشق تھا کہ باپ اسے رقیب کی نظر سے دیکھتا۔ لیکن اسنے جتنے عظیم لوگوں کی کہانیاں سن رکھی تھیں وہ سب کے سب یتیم تھے اس کا باپ ایک عظیم آدمی تھا۔ وہ اسی تناور درخت کے نیچے بیٹھ کر دادا جان کی جوان مرگی پر ماتم کرتا۔"(۱۲)

افسانچہ فرد کے کم حیثیت ہونے کا دکھ بیان کر رہا ہے جو کہ خود کو کسی بڑے درخت کی گھنی چھاؤں میں دبا ہوا محسوس کرتا ہے۔ جہاں جذبوں کی نرم دھوپ اس تک نہیں پہنچ سکتی اور وہ کسی خود رو جھاڑی کی طرح بونا رہ گیا۔ وجودی مفکرین کے ہاں یہ ایک موضوعی رویہ ہے۔

وہ ہر اس فرد یا شے سے خائف نظر آتے ہیں جو ان کے جذبے دروں اور ان کے خوابوں کے درمیان آتی ہے۔ وہ اپنے معاملات اور انفرادی زندگی میں کوئی خارجی مداخلت برداشت نہیں کرتے۔ فرد اپنے آپ کو دنیا سے جوڑے رکھنا چاہتا ہے اور خود کو دوسروں سے بہتر بنانے کی سعی کرتا ہے۔ وہ I (میں) کی خواہش میں ڈوب کر اپنی I (میں) کی تکمیل چاہتا ہے۔ یہ اس کی موضوعی (انفرادی) خواہشات کا پرتو ہے۔ افتخار نے اس ضمن میں لکھتے ہیں:

" فرد کی داخلیت کو عقل کی گرفت میں لینا ممکن نہیں جیسے مافوق الادراک ہیں۔ اسی فرد کی موضوعت اور فرد کے داخل کی دنیا کی مہجات بھی مافوق الادراک ہیں۔"(۱۳)

یہ تو طے ہے کہ فرد کی ایسی خواہشات اور سوچوں کا تعلق براہ راست فرد کی موضوعی کیفیات اور اساسی جذبات سے ہے۔ جہاں وہ کسی بھی دوسرے کی مداخلت برداشت نہیں کرتا اس کا بہتر حل ہے کہ وہ امکانات سے لڑ کر خود کو معتبر وجود ثابت کرے۔ نا کہ تساہل پسند ہو کر دوسروں پر الزامات لگاتا پھرے۔

افسانچہ "دشت جنوں"

افسانچہ "دشت جنوں" افسانوی مجموعے "ر" انتخاب کیا گیا ہے۔ فرد کے امکانات سے خانہ جنگی اور طویل سفر کا مختصر بیانیہ ہے۔ یہ تحریر فرد کے صدیوں کے سفر پر مبنی ہے۔ اس کی مشکلات، اذیتوں اور زندگی کی بیگانگی کے دکھ کی کہانی ہے۔ یہ دشت جنوں میں چلتے اس فرد کے دکھ کی کہانی ہے جو شعور و آگہی کے نشتر سے زخمایا گیا ہو۔ اسے اپنے زخموں کا مداوا بھی چاہیے اور ایک سرسبز جہان بھی جس میں آباد ہو کر وہ اپنی

دریافت کر سکے۔ وہ کتنے نوری سالوں کا فاصلہ طے کر چکا، کتنے رستے بدل چکا، کتنے انقلابات برپا کیے، کتنی جنگیں لڑیں مگر وہ آج بھی اپنا من چاہا جہاں تخلیق نہیں کر سکا اور جہاں وہ بنا کسی پابندی کے اپنی من مرضی سے زندگی جی سکے گا۔ سائنسی اور عقلی دلیلوں اور نظاموں سے پرے ایک ایسی زندگی جو اس کی موضوعی کیفیت کا عکس لئے ہوئے ہو۔ وہ سماجی، مذہبی اور تہذیبی اقدار سے بے نیاز ہو کر جیے۔ سید ماجد شاہ نے اس طویل سفر کے کرب کو چند سطروں میں جس خوبصورتی سے سمویا ہے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

"پتھر کوٹنے والے کیا جانے وقت کی سل کیا ہوتی ہے۔ میں نے اپنا وقت پیس پیس کر اسے لمحہ لمحہ کیا۔ خاک چھاننے والا مجنوں کیوں کر اندازہ کر سکتا ہے۔ ریزہ ریزہ اکٹھا کرنا کیا ہی مشکل ہے۔ ہے کوئی داستان گو؟ ہے کوئی جو مجنوں کا طلسم توڑ سکے؟ ہے کوئی جو مجھ سے دریافت کرے؟"(۱۴)

وجودیت اضطرابی کیفیت میں جنم لینے والا فلسفہ ہے۔ یوں تو یہ فرد کی پیدائش کے ساتھ ہی جنم لے چکا تھا۔ مگر اس کو باقاعدہ منظم ہوتے وقت لگا۔ اس کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی تاریخ و تہذیب ہر دور میں چاہے انقلاب ہو یا جنگ، سماجی طویل ہو یا مذہبی عروج فرد کی انفرادی زندگی کو ہمیشہ نقصان پہنچایا گیا۔ بے دریغ لاکھوں افراد کی زندگی کو خرچ کر دیا گیا۔ انسانی لاشوں کے ڈھیر لگا دیے گئے۔ یہ تو حالت جنگ اور انقلابات کے تذکرے ہیں۔ حالت امن میں بھی سماجی نظاموں میں جکڑ کر فرد کی داخلیت کو پامال کیا گیا۔ اس نے جہاں بغاوت کی کوشش کی سزا پائی۔ ایسے میں ہر بار پر دنیا اپنے موضوع احساسات سے دوبارہ ہمت پکڑی اور اثبات ذات کے لیے کوشاں ہوا۔ اس نے بار بار اپنے شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے دوبارہ اپنی شخصی آزادی اور شناخت کو ممکن بنایا۔ یہ عمل وہ اپنی پیدائش سے لے کر موت تک سرانجام دیتا ہے۔ اور صدیوں کا سفر طے کرتا ہوا اس مشینی دور میں آ پہنچا۔ سید ماجد شاہ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس طویل سفر کے بعد بھی فرد کی تلاش ختم نہ ہوئی۔ وہ آج بھی جہد مسلسل کا شکار ہے۔ اور اپنے ہی دست جنوں میں ہی دھنستا چلا جا رہا ہے۔ لیکن وہ اپنی انفرادیت کی جنگ پھر بھی لڑ رہا ہے۔

افسانہ "صبورہ"

افسانہ "صبورہ" سید ماجد شاہ کے پہلے افسانوی مجموعے "ق" سے انتخاب کیا گیا ہے۔ صبورہ ہمارے معاشرے میں جاگیر دارانہ نظام کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ اس افسانے میں ہمیں ایک تو جاگیر دارانہ

نظام اور دوسرا عورت کی انفرادی زندگی پر زبردستی حاوی ہونے والے عناصر کا ذکر ملتا ہے۔ افسانہ روایت کا بیانیہ ہے۔ کہانی بھی نئی نہیں مگر اس کے نفسیاتی پہلو بہت اہم ہیں۔ جن سید ماجد شاہ نے نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ کہانی کا آغاز وہی روایتی چودھراہٹ کے مناظر سے ہوتا ہے کہ ایک امیر چوہدری سے بظاہر تو شریف النفس اور عوام دوست نظر آتا ہے۔ مگر اس کی حویلی کی بلند دیواریں کسی عقوبت خانے سے کم نہیں ہیں۔ لالچ کی انتہا اس قدر ہے کہ جائیداد کے بٹوارے کے خوف سے دو جوان بہنوں کو گھر میں بٹھار کھا ہے جن کی شادی نہیں کی جارہی ہیں وہ تمام مادی آسائشوں کو حاصل کر سکتی ہیں مگر اپنی موضوعی کی کیفیات اور وجودی تعلقات کے لئے آزاد نہیں۔ پنچائیت کا منظر ہے جس میں ایک پڑھی لکھی اور سنجیدہ خاتون کو مجرم بتایا جارہا ہے۔ چودھری اپنی عادت سے مجبور بار بار عورت کے سراپے کو اپنی مکروہ اور غلیظ آنکھوں سے دیکھتا جارہا ہے اور ساتھ ساتھ اس پر لگے ماں کی تفصیل بھی سنتا ہے۔ عورت پر الزام ہے کہ وہ تعلیم اور ہنر کے نام گاؤں کی عورت کو بے حیائی کا رستہ دکھارہی ہے جس سے گاؤں کی عورتیں فحاشی اور بے راہ روی کا شکار ہورہی ہیں۔ مگر گاؤں کے لوگ جذباتی ہو کر اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ جس پر خاتون عورتوں کے حقوق اور انہیں اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے کی اجازت ملنے پر بات کرتی ہے۔ لوگ یہ باتیں سن کر عورت کو مارنے لگے عورت کو چوہدری عقوبت خانے میں بند کر دیا گیا۔ بعد میں خبر آئی کہ عورت کو پھانسی دے دی گئی۔ مگر کسی نے لاش نہیں دیکھی کچھ لوگوں کے خیال میں وہ زندہ ہے لیکن ایک تبدیلی واقع ہوئی ہے کہ چوہدری کی بہنوں کے مزاج اب کڑوے نہیں رہے وہ اب نرم مزاج اور محبت کی طالب ہیں۔

افسانے کا اختتام عجیب سوالات اضطرابی کیفیات پر مبنی ہے خاص کر مجرم عورت کی آخری تقریر اور اس کا پر سرار انجام کیا وہ مار دی گئی یا چوہدری کے پاس ہے کوئی کچھ نہیں جانتا۔ خاتون کس طرح خواتین کی انفرادی اور شخصی زندگی اور آزادی کے متعلق بات کرتی ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> " تو سنیے بابل اور اشوریا کے قدیم کھنڈرات میں جو محلات اور مندر دریافت ہوئے ہیں۔ ان پر صبورہ کی تصویریں پائی جاتی ہیں اس طرح صبورہ کی تاریخ پانچ چھ ہزار سال پرانی ہے۔ تقریباہر قدیم زبان میں یہ نام موجود ہے۔ میں عورت کی عزت چاہتی ہوں اسے ذلیل و حقیر نہ سمجھا جائے۔ تمہاری مطلقہ اور بیوائیں تم جیسے ہوس پرستوں کا نشانہ بن

کر ذلیل و خوار نہیں ہوتیں۔ انہیں عزت نہیں دے سکتے تو کم از کم ان
سے یہ سب نا چھینو"(۱۵)

افسانے کا مرکزی کردار یعنی مجرم عورت بظاہر گاؤں کے سادہ لوح عوام کی غلط سوچ کے نتیجے میں مجرم بنی ہوئی ہے۔ وہ تو گاؤں کی خواتین کو بنیادی تعلیم اور ہنر سکھانے کی کوشش میں تھی۔ وہ ان کے خیالات بدلہ چاہتی تھی تاکہ وہ سماجی جبر سے آزادی اور انفرادیت کی راہ پر چل سکیں۔ اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ مگر وہی جاگیر دارانہ نظام اور دقیانوسی خیالات اس کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں چودھری بظاہر تو عورت کے حق کے لیے لڑتا اور اسے بچاتا نظر آتا ہے۔ لیکن در حقیقت تمام فساد کی جڑ وہی ہے۔ اختتام ہمیں یہی بتاتا ہے کہ جبر کی قوت نے ہمیشہ فرد کی شخصی آزادی اور انفرادی زندگی پر قدغن لگایا اور ایسی آواز کو ہمیشہ دبانے کی کوشش کی جاتی ہے یا اسے منظر سے ہی غائب کر دیا جاتا ہے۔

خصوصاً ہمارے ہندوستانی اور پاکسانی معاشرے کا یہ المیہ ہے۔ ایک طرف تو مذہبی اور اخلاقی نظاموں کا ڈھنڈورا پیٹ کر فرد (عورت) کے حقوق غضب کرنے اور انہیں دبانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ مزاحمت تبھی کارگر ہے۔ جب اتحاد قائم ہو۔ تب ہی سماجی طاقت کو کچل کر شخصی آزادی اور انفرایت کو برقرار رکھا جاسکتا جو کہ صبر طلب کام ہے۔ افسانے کا عنوان و موضوع "صوبرہ" بھی اسی طبقاتی شعور کے پیدا کرنے اور صبر سے بدلاؤ لانے کی ایک کاوش ہے۔ جس میں سید ماجد شاہ نے فرد کی انفرادی کیفیات کو اس کے نفسیاتی شعور سے جوڑ کر خوش اسلوبی سے نبھایا۔

حوالہ جات

۱۔ قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۵، ص ۱۵

۲۔ افتخار بیگ، ڈاکٹر، وجودیت اور اردو شعری طرز اظہار، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶، ص ۱۷

۳۔ سید ماجد شاہ، ق، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶، ص ۱۷

۴۔ ایضاً، ص ۲۳

۵۔ ایضاً، ص ۶۹، ۶۸

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۷۔ حیات عامر حسینی، ڈاکٹر، وجودیت، بتول پبلیکیشنز، سیر نیگر، ۱۹۹۱، ص ۶۴

۸۔ سید ماجد شاہ، ر، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸، ص ۳۴

۹۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۷، ۲۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۵

۱۳۔ افتخار بیگ، ڈاکٹر، وجودیت اور اردو شعری طرز اظہار، ص ۵۰

۱۴۔ سید ماجد شاہ، ر، ص ۷۹

۱۵۔ سید ماجد شاہ، ق، ص ۱۳۰، ۱۳۱

ماحصل

الف: مجموعی جائزہ

فلسفہ وجودیت کو علم، اقدار، تاریخ اور انسانی مسائل سمیت مشرقی و مغربی تناظرات کے تناظر میں دیکھنے سے اس فلسفے کی پر اسرایت اور معانی و مفاہیم کے کئی نئے در وا ہوئے۔ یہ تو طے ہے کہ انسان ایک وحدت بھی ہے۔ تو ایک معمہ بھی ہے اور ہر ایک کا ایک جدا المیہ بھی ہے۔ کائنات میں آکر فرد اپنے مسائل اور اثبات کی جنگ خود لڑتا ہے اور اپنی بازیافت کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اندھی تقلید فرسودہ روایات اور نظاموں کے خلاف بر سر پیکار رہتا ہے۔ یہی رجحانات موجودہ دور میں فلسفہ وجودیت کی صورت ہم تک پہنچے گو کہ مشرق و مغرب میں اس فلسفہ کو شدید تنقید نے فلسفے کے کئی گمنام پہلوؤں کو سنجیدہ نکتہ نظر سے سوچنے اور سمجھنے کی دعوت دی۔ اس مشینی دور میں بھی جدید فرد کے بھی وہی بنیادی مسائل اور سوالات ہیں۔ جو صدیوں قبل کے فرد کے تھے۔ ان مسائل اور سوالات کی نوعیت و کیفیت نہ ہی سائنسی ہے نہ ہی عقلی تو ان کے جواب تلاش کرنے کے لیے فرد کو اپنی ذات کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانکنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سو انہیں وجودی مسائل یا وجودی سوالات کہا جا سکتا ہے۔ وجودی مسائل کا براہ راست تعلق فرد کی موضوعی کیفیات سے ہے۔ یہ پوری انسانی شخصیت کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ فلسفہ وجودیت کائنات اور ماورائی طاقت (خدا) کے درمیان تعلق کے بارے میں آگہی کا نام ہے۔ یہ لفظ وجود (Existance) سے مشتق ہے۔ یہ خالصتا انسانی وجود کے متعلق بحث کا نام ہے۔ جس میں فرد کے وجودی مسائل کو موضوعی رجحانات اضطراب، تنہائی، کرب اور روحانی تناؤ کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ فلسفہ وجودیت تمام سائنسی، تجریدی اور عقلی نظاموں کی نفی کرتا ہے۔ یوں تو فلسفہ وجودیت کی تاریخ انسانی و تہذیب جتنی ہی پرانی ہے۔ مگر اس کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ بیسویں صدی تیز ترین سائنسی و عقلی تبدیلیوں کا دوسرا نام ہے۔ اس دور نے زندگی کے ہر شعبے، مذہب، سیاست، سماج ادب اور فلسفیانہ پس منظر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ ایک زبردست اور طاقت ور رد عمل تھا۔ جس نے تمام اندھے اعتقات اور، دقیانوسی بتوں کو اندھے منہ گرادیا ان پر کئی شدید سوالات اٹھائے کیونکہ زبردست انقلابات، خون ریز جنگوں، مستحکم معاشی نظاموں اور اندھے مذہبی اعتقادات ہونے کے باوجود فرد کے موضوعی مسائل جوں کے توں رہے۔ بلکہ وہ اپنے ہی بنائے گئے ترقی یافتہ سماج میں بالکل تنہا رہ گیا۔ یوں فلسفہ وجودیت کی بنیاد پڑی جس نے فرد کے وجود کو اتنی اہمیت دی کہ اس کے جوہر تک کو تسلیم کرنے سے انکاری

رہا۔ وجودی مفکرین کے نزدیک وجود ہر شے پر فوقیت رکھتا ہے۔ فطرت اور خدا سے تعلق کی وجہ بھی اس کا وجود پر یقین ہے۔ آگے چل کر وجودی مفکرین دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں پہلے وہ جو اضطرابی کیفیت اور نا معتبری کی حالت میں خدا کے دامن میں پناہ لیتے ہیں اور دوسرا وہ گروہ جنہوں نے فرد کی مشکلات اور زندگی کی لغویت سے بیزار ہو کر خدا کے وجود سے انکار کر دیا۔ الہیاتی مفکرین کرکیگارڈ پال ٹلچ، نیکولائی برود، جیسپرز، اور مارسل جبکہ الحادی مفکرین میں سارتر، ہائیڈیگر، نطشے اور کامیو سمیت کئی دوسرے نام نظر آتے ہیں۔ وجودی مفکرین کے بلاشبہ دو گروہ ہونے کی وجہ سے اس فلسفے میں کئی دراڑیں پیدا ہوئیں اور مخالفین نے اس پر شدید تنقید کی کہ یہ کس طرح کا فلسفہ ہے جس کے فلسفی آپس میں ہی متفق نظر نہیں آتے۔ مذہب اگر کسی فرد کا خاص ذاتی معاملہ ہے تو اس کے اثرات فلسفے پر ہونے لازم نہیں مگر اثبات وجود اس تصور آزادی اور انفرادی و موضوعی تصورات کے حوالے سے تمام وجودی مفکرین متفق نظر آتے ہیں۔ وجود خود پر بھروسہ کر کے اپنے اعمال و انتخاب کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ وہ معتبر وجود ہے۔ اور جو ذمہ داری سے فرار حاصل کرے اور امکانات سے گھبرائے وہ نامعتبر وجود فرد جب تک عقلی و مادی دنیا سے مزاحمت کرتا رہتا ہے وہ اپنی موضوعیت (انفرادیت) اور آزادی برقرار رکھ سکتا ہے لیکن جونہی وہ اس سے بے خبر ہوا یہ نظام اس کی آزادی و انفرادیت کو نگل لیتے ہیں اور وہ نہ ختم ہونے والی لغویت اور لایعنیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف نا معتبر شخص ذرا سی کوشش سے دوبارہ معتبری کی طرف راغب ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے وجود اور موضوعی رویوں پر اعتماد کرنا سیکھ لے۔

وجودی موضوعات میں وجود، موضوعیت و صداقت، داخلی واردا تیں، تصور آزادی، امکان و فیصلہ اور لغویت اور نئی وجودیت اہم ہیں۔ جن کے اہم عناصر کرب، خوف، تشویش، لایعنیت، تصور آزادی ،اضطراب، تشکیک اور فرد کی انفرادیت زیادہ قابل ذکر ہیں۔ دیگر اصناف ادب کی طرح فلسفہ وجودیت بھی مغرب سے سفر کرتا ہوا مشرق تک پہنچا۔ گو کہ یہ فلسفہ انتشار و اضطراب کی کیفیت میں جنم لیتا ہے۔ تو جہاں جہاں بھی اضطراب و انتشار کی کیفیت ہو گی فلسفہ وجودیت وہاں موجود ہو گا۔ مغربی وجودیت میں کرکیگارڈ سے لے کر ژاں پال سارتر تک تمام مفکرین وجود کی اہمیت اس کی آزادی اور انفرادیت پر متفق نظر آتے ہیں۔ خدا کے ماننے والے اپنے خوف اور تشکیک کے اوقات میں رب کی پناہ میں چلے جاتے ہیں اور روحانی طاقت حاصل کرتے ہیں۔ جو انہیں دوبارہ امید اور رجائیت کا رستہ دکھاتا ہے جبکہ الحادی وجودی مفکرین کے ہاں اپنے تمام افعال و اعمال کی ذمہ داری خود پر ہوتی ہے۔ خدا کا تصور یا تو انتہائی کمزور ہے یا بالکل نہیں ہے بلکہ بعض نے

مرگ خدا کا اعلان کر دیا۔ ان مفکرین کے نزدیک یہ زندگی لغو ہے۔ انسان کو زبردستی اس دنیا میں بھیج دیا گیا ہے اسے ہر لمحہ محدودیت کا سامنا ہے۔ وہ تمام عمر اپنی آزادی اور انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے امکانات سے نبرد آزما رہتا ہے اور آخر میں یا وہ خود موت کے حوالے ہو جاتا ہے یا موت اسے اچک لیتی ہے۔ یہ سراسر قنوطیت اور ناامیدی کا فلسفہ نظر آتا ہے جو یہ فلسفہ جب مشرق میں پہنچتا ہے تو یہاں رنگارنگ تہذیبی فکر، اساطیری دنیا میں ایک نیا تناظر لے کر ابھرتا ہے۔ یہاں موجود مذہبی افکار یورپ کی طرح انتشار کا شکار نہیں ہیں اس لیے خدا کا مضبوط تصور موجود ہے۔ وجودیت کے مشرقی تناظرات کی فکر کا سرچشمہ مغربی تہذیب سے ہی پھوٹا ہے۔ مگر یہاں کے مذہبی تصورات اسلامی فلسفہ اور تصوف اور دیگر مذاہب کی رنگینیوں سے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ اسلامی تصوف اور اقبال کے افکار کے مطالعے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تصوف عرفان ذات اور تکمیل شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ مشرق ہو یا مغرب تصوف کے کئی رجحانات سامنے آتے ہیں۔ مگر سب میں وجود کی اہمیت اور آزادی کی بات کی گئی ہے مغربی وجودیت کی بڑی کمی خدا اور انسان کے تعلق کا کمزور ہو جانا ہے۔ جو کہ نام نہاد مذہبی ٹھیکیداروں اور روایتی نظاموں کی وجہ سے بحران کا شکار ہوا۔ مشرق میں یہ کمی اساطیر اور تصوف نے پوری کر دی۔ اس لئے خدا سے جڑے رہنے کی وجہ سے ایک رجائی پہلو باقی رہتا ہے جو کہ امید اور مسرت کے در کو کھلا رکھتا ہے۔

یہ مشرقی وجودیت کا مثبت پہلو ہے۔ مگر اب خال خال وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی روایات اور اساطیر کے دائرے توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش میں ہیں۔ اگر مشرق خاص کر برصغیر پاک وہند موجودہ (پاکستان اور بھارت) کی تو یہ خطہ صدیوں سے اب تک اضطراب و انتشار کا شکار رہا۔ آپسی خانہ جنگی، بادشاہت کے نظام، چھوٹی بڑی ریاستوں اور مختلف مذاہب اور نظاموں میں جکڑے اس خطے نے ہمیشہ فرد کے وجودی اثبات اور آزادی پر قدغن لگایا اور فرد ہمیشہ اپنے وجود کی پہچان اور آزادی کے لیے لڑتا رہا۔ پھر خانہ جنگی اور سالوں کے نوآبادیاتی نظام کے بعد اس خطے کو تقسیم کر دیا گیا۔ تقسیم کے دکھ نے فرد کو پھر ایک نیا انتشار اور کرب دیا جس سے کروڑ لوگ متاثر ہوئے۔ تقسیم کے بعد آبادکاری، حکومتوں کے ٹوٹنے بننے اور نااہلیوں سے پیدا ہونے والے کرب کی ایک الگ داستان ہے۔ اس طرح پاکستان کو بھی کئی ایک مسائل کا سامنا رہا تین جنگیں، ایک حصے کا الگ ہو جانا، معاشی، مالی و جانی نقصان، حکومتی نااہلی، کرسی کے لئے لڑایاں، نااہل حکمران، مسلط جاگیردارانہ نظام، فرسودہ روایات، دشمن عناصر غربت بھوک اور بے روزگاری اور دیگر سماجی مسائل سمیت دہشت گردی کا شکار رہا۔ جس کی وجہ سے انسان مسلسل کرب خوف اور اضطراب میں مبتلا رہا۔ اس کا براہ راست اثر ہمارے

ادب پر بھی پڑا۔ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے قلم کے ذریعے مسائل کے خلاف آواز بلند کی اور فرد کے حق میں اپنے قلم سے جہاد کیا۔ شعراء اور ادیبوں نے جانے انجانے میں فلسفہ وجودیت کو بھی اپنے موضوعات میں سمویا۔ اردو ادب کے نامی گرامی لکھاریوں کی تحریروں میں ہمیں وجودی فکر پنہاں نظر آتی ہے۔ جدید فرد کن اور نفسیاتی مسائل کا شکار ہے یہ جاننے کے لیے اس عہد کے کسی لکھاری کی تحریروں تجزیہ لازم تھا۔ تاکہ جدید مشینی زندگی کے وجود مسائل کا اندازہ ہو سکے۔ سید ماجد شاہ عصر حاضر کے بہترین قلمکار ہیں۔ جو جدید معاشرے کے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ سید ماجد شاہ کے افسانے سماجی شعور سے لبریز ہیں وہ قدرے مختلف اور حقائق پر مبنی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ فرد کی نفسیاتی تہہ داریاں بھی کھولتے نظر آتے ہیں۔ سماجی رویے اور فرد کی نفسیات مل کر نئے انکشافات کو جنم دیتے ہیں۔ ماجد شاہ کا اسلوب رواں اور شفاف ہے جملوں کا ربط علامتی انداز اور شعری انداز قاری کو اپنے حصار میں جکڑ لیتا ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعوں "ق" اور "ر" کے انتخاب سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ آپ کے افسانوں پر وجودی رنگ غالب ہے۔ انسان کے بنیادی وصف، لایعنیت کا خوف، اضطراب اور آزادی و انفرادیت کی خواہش، اساسی کیفیات غالب ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے احساس ہوا کہ جدید دور کے فرد کو جن تین اہم وجودی عناصر کا سامنا ہے وہ ہیں لایعنیت، تصور آزادی اور فرد کی انفرادیت۔ افسانوی کردار زندگی کی لایعنیت سے لڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ شخصی، سماجی اور تہذیبی جبر کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اپنے لئے آزادی اور انفرادیت کے راستے چنتے ہیں اپنی شخصی آزادی پر کسی طرح کا قدغن برداشت نہیں کرتے۔ اپنے انتخاب اور فیصلے میں آزاد ہیں۔ اپنے اعمال و افعال کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ اپنی شخصی آزادی اور انفرادیت کو برقرار رکھنے کی سعی مسلسل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض افسانہ آزادی اور ابنوہ کے فرق پر ہیں جو کہ فرد کی نامعتبری کی وجوہات کا پتہ دیتے ہیں۔ وجودی تعلقات کی ناہمواریاں، وجودی تحلیل نفسی کے مسائل، جنسی مسائل اور ان کی غلط پیوندکاری اور جو فرد کے اضطراب و انتشار کا سبب ہیں پر بڑے ہی خوبصورت نیم علامتی انداز میں بات کی گئی۔ سید ماجد شاہ کے ہاں زندگی کے خوبصورت استعارے موجود ہیں ان کے سبھی کردار خوبصورت اور منفرد ہیں۔ ہر کردار فرد کے موضوعی رویوں کا عکس لئے ہوئے ہے وہ موضوع اور نفسیاتی مسائل جن پر ہمارے معاشرے میں بات کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ سید ماجد شاہ نے نا صرف ان پر بات کی بلکہ ڈھکے چھپے الفاظ میں مسائل کا حل بھی بتایا ہے۔ نفسیاتی حربے استعمال کر کے اخلاقی اقدار کے انہدام اور سماجی و تہذیبی اثرات کی وجہ پر بات کی۔ جہاں بھی فرد کی موضوعی زندگی کو خطرہ ہو گا سماج کے باشعور افراد اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کریں گے۔ وہ اس میں

کامیاب ہوتے یا نہیں وہ ایک الگ موضوعی ہے۔ مگر اس فلسفے کا بنیادی منہاج فرد کو اس کی موضوع کیفیات سے آگاہ رکھنا اپنے وجود اور یکتائی کی اہمیت معلوم ہونا اور لگے بندھے نظاموں اور سائنسی و عقلی زندگی سے اجتناب برتنا ہے۔ فلسفہ وجودیت فرد کی انفرادیت، آزادی اور استقامت پر زور دیتا ہے کہ وہ زندگی کی محدودیت کے باوجود اس سے نبرد آزما ہونے کا ہنر سیکھ لے اور وہ اس سماج میں I (میں) کی حیثیت سے رہے نہ کہ IT (یہ) یا کوئی شے بن کر رہ جائے۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں وجودی عناصر کی موجودگی تو ہے ہی مگر یہ وجودی عناصر ہمیں قنوطیت کی طرف راغب نہیں کرتے بلکہ ایک امید اور رجائی پہلو سامنے رکھتے ہیں تاکہ فرد نئے مکانات سے نبرد آزما ہو کر پہلے سے بہتر فیصلے کرنے کی کوشش کرے اپنی آزادی برقرار رکھے اور انفرادی طور پر کارآمد بن سکے۔ اس میں احساس ذمہ داری ہو جو اسے استقامت اور استواریت عطا کرے اور لایعنی کیفیات میں بجائے مایوسی کے خدا سے رجوع کرے تاکہ روحانی طاقت حاصل کر کے معتبر وجود کہلا سکے۔ اپنے من کے سوالوں کے جواب پائے عرفان خودی ہی عرفان الٰہی کا سبب ہے جو کہ اپنی ذات پر یقین کی صورت ہی ممکن ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

اگر نہ درد میری روح میں اتر جاتا
میں جیسا بے خبر آیا تھا بے خبر جاتا

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ اپنے شعور اور احساسات کے ذریعے اپنی ذات کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے اور یہ احساس اسے درد اور لایعنیت کی کیفیات عطا کرتی ہیں ورنہ وہ دیگر مخلوقات کی طرح بے خبری کی زندگی گزار کر دنیا سے گزر جاتا ہے۔

ب۔ تحقیق نتائج

وجودیت کے مشرقی اور مغربی تنازعات سید ماجد شاہ کے افسانوں کا تجزیہ کرنے سے درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

۱۔ وجودیت انسانی صورتحال اور اس کی موضوعی صداقتوں کا ایسا مجموعہ ہے جو فرد کو فرسودہ روایات اور عقلی و تجریدی زنجیروں سے نجات دلاتا ہے جبر سے آزاد ہو کر انفرادی طور آزادی سے جینے کی راہ دکھاتا ہے جبکہ اس کے مشرقی و مغربی تناظرات میں جو سانجھ ہے وہ فرد کے اثبات وجود اس کی آزادی اور انفرادیت پر متفق ہونا ہے جو کہ امید افزا اور رجائیت سے بھرپور ہے۔

۲۔ سید ماجد شاہ کے افسانوں میں ہمیں کرب، اضطراب، خوف، لایعنیت، تصور آزادی اور فرد کی انفرادیت جیسے وجودی عناصر ملتے ہیں۔

۳۔ سید ماجد شاہ کی تحریروں کا ادبی و فکری مقام اگر وجودیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان پر وجودی رنگ حاوی نظر آتا ہے۔ افسانوں کے کردار سماجی، تہذیبی، مذہبی اور شخصی جبر کے خلاف نبرد آزما نظر آتے ہیں اور لایعنیت، آزادی اور انفرادیت کی خواہش جابجا انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہے۔

ج۔ سفارشات

اس تحقیقی مقالے میں وجودیت کے مشرقی و مغربی تناظرات سید ماجد شاہ کے افسانوں کا تجزیہ کیا گیا۔ اس حوالے سے سفارشات درج ذیل ہیں۔

۱۔ فلسفہ وجودیت کے رجائی پہلوؤں پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

۲۔ جدید معاشرے کے مسائل اور وجودی عناصر کے رجحانات کو موجودہ ادب کے تناظرات میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ سید ماجد شاہ کی دیگر ادبی تخلیقات پر تحقیق کی جاسکتی ہے۔

۴۔ سید ماجد شاہ کا معاصر ادباء اور شعراء کے ساتھ تقابل کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

سید ماجد شاہ، ق، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء

سید ماجد شاہ، ر، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸

ثانوی مآخذ:

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ۲۰۱۸

انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء

انور سدید، ڈاکٹر، ایک صدی کے افسانے، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۰ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۹۱ء

احسان اشرف، پروفیسر، وجودیت کا فلسفہ، قومی کونسل، برائے اردو، پٹنہ ۲۰۱۰ء

افتخار بیگ، ڈاکٹر، وجودیت اور اردو شعری طرز اظہار، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

بشیر احمد سوز، پروفیسر، ہزارہ میں اردو افسانے کی روایت، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، ۲۰۱۰ء

بشیر احمد سوز، پروفیسر، ہزارہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ، ادبیات ہزارہ، ۲۰۱۰ء

باری، انقلاب فرانس، مکتبہ اردو، لاہور ۱۹۴۰ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، ایجوکیشنل، پبلشرز، دہلی، ۱۹۸۹ء

جمیل احمد مجبی، ڈاکٹر فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، دہلی ۲۰۰۲ء

حیات عامر حسینی، وجودیت، بتول پبلی کیشنز، سرینگر، ۱۹۹۱ء

خالد محبوب (مرتب)، ژاں پال سارتر ادب، فلسفہ وجودیت، نگارشات. پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء

خالد سہیل، مذہب سائنس نفسیات (تراجم) موڈرن پبلی کیشنز ہاوس، دہلی، ۲۰۰۱ء

سلطان علی شیدا، وجودیت پر ایک تنقیدی نظر، اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء

سید فضل اللہ بخاری، جنگ عظیم اوّل، دارالشعور، لاہور، ۲۰۱۰ء

شیما مجید، نعیم الحسن، ادب فلسفہ اور وجودیت، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۲ء

شہزاد مظہر، جدید اردو افسانہ، مظہر پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۱ء

قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاوس، کراچی، ۲۰۱۵ء
محمد مرزا دہلوی، دوسری جنگ عظیم، کتب خانہ علم وادب، دہلی، ۱۹۴۱ء
مولانا وحید الدین خان، مذہب اور سائنس الراسالہ، دہلی، ۱۹۸۰ء
محمد اسد محمد، حسینی، (ترجمہ)، طوفان سے ساحل تک، آمین آباد، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء
میر ولی الدین، ڈاکٹر، فلسفہ کیا ہے؟، اردو بازار، دہلی، ۱۹۶۲ء
نگہت ریحانہ، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ، فنی و تکنیکی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء
وقار عظیم، فن وافسانہ نگاری، الوقار پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۶ء
یاسر جواد، علم فلسفہ کے معمار، ایک سو عظیم فلسفی، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

لغات

فیروز اللغات، اُردو جدید، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور
سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، مکتبہ حسن، لاہور، ۱۹۷۴ء

رسائل و جرائد / اخبارات

ارمغان ادب، سالنامہ، دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، راولپنڈی، ۲۰۱۷ء
ادبیات سہ ماہی، ادبیات پاکستان، اسلام آباد، متعدد شمارے
پاکستان، اسلام آباد، روزنامہ، آوٹ بیورو سرکولیشن، اسلام آباد، فروری، ۲۰۱۹ء
جناح، روزنامہ، لاہور، ۷ فروری، ۲۰۱۹ء
نوائے وقت روزنامہ، لاہور، ۲ جنوری، ۲۰۲۱ء
یادیں، روزنامہ، لاہور، ۲ جنوری، ۲۰۲۱

انٹرویوز

سید ماجد شاہ، (انٹرویو)، از شمائلہ عزیز، اسلام آباد، ۴ جنوری ۲۰۲۲ء
سرمد سروش، (انٹرویو)، از شمائلہ عزیز، اسلام آباد، ۴ جنوری ۲۰۲۲ء
مفیدہ ماجد، (انٹرویو)، از شمائلہ عزیز، اسلام آباد، ۴ جنوری ۲۰۲۲ء